انسان اور دیوتا

نسیم حجازی

جہانگیر بک ڈپو
• لاہور • راولپنڈی • ملتان • حیدرآباد • کراچی

ناشر: ریاض اے۔ شیخ (ایڈووکیٹ)

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail:info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

اشاعت: 2005

سرورق: JBD آرٹ سیکشن، لاہور

قیمت: -/225 روپے



آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون: 051-5552929
سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدر آباد۔ فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔ فون: 061-4781781
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔ فون: 042-7314319

عنوانات

عرضِ حال ..
پیش لفظ ..
بارھویں ایڈیشن کا پیش لفظ ..
تعارف ..
دیوتاؤں کے سپاہی ..
سماج کا باغی ..
سزا ..
آخری سہارا ..
شہروں سے دُور ..
راجہ اور پروہت ..
نیا سردار ..
رامو کی سرگزشت ..
نیا دیوتا ..
سیلاب ..
رامو کا انتقام ..
اپنا دیس ..
ننھے پجاری ..

بھگوان کا اوتار .
سنگ تراش .
بدھو اور شنکر .
رندھیر اور شانتا .
سپیرا .
مادھو کی دیوی .
سماج کی فتح .
قربانی .
اعتراف .
صبح امید .

بھارت ماتا

کے

سوتیلے بیٹوں کے نام!

نسیم حجازی

دیوتاؤں کے سپاہی

ساون کے دن تھے۔ دریائے بیاس اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ کنارے پر چند کشتیاں جن کے رسّے بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے پانی کی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھیں۔ چند ملاح کشتیوں کے پاس کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

ایک بوڑھے ملاح نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دوسرے کنارے تک نگاہ دوڑائی اور مڑ کر ایک نوجوان سے جو لباس سے فوجی افسر معلوم ہوتا تھا سوال کیا:

"کیوں مہاراج! آپ کو یقین ہے کہ وہ آج ضرور آ جائیں گے۔"

نوجوان نے جواب دیا "وہ آتے ہی ہوں گے؟"

"تو کیا اُن کے لیے آج ہی دریا عبور کرنا ضروری ہے۔ وہ ایک دو دن پانی اُتر جانے کا انتظار نہیں کر سکیں گے؟"

"ہرگز نہیں سیناپتی جی، مہاراج کے ساتھ وعدہ کر چکے ہیں کہ وہ دس دن کے اندر اندر یہ مہم سر کر لیں گے۔ وہ ایک پل بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے۔"

"لیکن مہاراج! آپ انہیں ضرور سمجھائیں۔ ایسے طوفان میں کشتی ڈالنا خطرے سے خالی نہیں۔"

"تم شاید سیناپتی سکھدیو کو نہیں جانتے وہ اپنی دھن کے پکے ہیں۔"

ملاح نے پوچھا "وہ تیرنا جانتے ہیں؟"

"کون؟"

"سیناپتی جی۔"

"اس سے تمہارا مطلب؟"

"مہاراج! اگر وہ تیرنا نہ جانتے ہوں تو آپ انہیں کشتی پر سوار ہونے سے منع کریں۔ بڑے آدمیوں کی جان بہت قیمتی ہوتی ہے۔"

نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا "تم فکر نہ کرو وہ تیرنا جانتے ہیں اور اگر تیرنا نہ بھی جانتے ہوں تو بھی وہ ملاحوں سے کام لینا جانتے ہیں۔"

"مہاراج! اس جگہ سے دریا عبور کرتے ہوئے اگر کشتی اُلٹ گئی تو اس میں ہمارا قصور نہ ہوگا۔ ہم اس راستے سے واقف نہیں۔ دوسرے کنارے کی اونچی چٹانوں کے درمیان کشتی لگانے کے لیے بہت تنگ جگہ نظر آتی ہے۔ اگر ہمیں اپنے گھاٹ سے دریا عبور کرنے کا حکم ہوتا تو ہمیں اس پانی کی پروا بھی نہ ہوتی۔ ہمیں اس جگہ کشتیاں لانے میں چار دن لگے ہیں اس وقت پانی بہت کم تھا لیکن بھگوان جانتا ہے کہ ہم جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں پہنچے ہیں۔ ایک کشتی راستے میں چٹان کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہے اور اب خبر نہیں کیا ہوگا۔ اگر وہاں سے دریا عبور کر لیتے تو کیا حرج تھا؟"

بوڑھا ملاح یہاں تک کہہ کر نوجوان کے جواب کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ بے پروائی سے دوسرے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا اور ملاح کو اپنی بات دہرانے کی جرأت نہ ہوئی۔

اس نوجوان کا نام رام داس تھا اس کی عمر اگرچہ چھبیس سال کے قریب تھی تاہم چہرے کی بشاشت اور تر و تازگی سے وہ اٹھارہ سال کا نوجوان معلوم

ہوتا تھا اس کے چہرے سے سپاہیانہ تمکنت کی بجائے کچھ اس قسم کی سنجیدگی اور شرافت ٹپکتی تھی کہ دیکھنے والا ایک ہی نگاہ میں محبت، عقیدت اور اعتماد کے جذبات سے مغلوب ہو کر رہ جاتا۔ رام داس تیوری سے زیادہ مسکراہٹ سے کام لینے کا عادی تھا۔

تھوڑی دیر بعد رام داس نے مڑ کر بوڑھے ملاح کی طرف دیکھا اور سوال کیا "تم نے پہلے کبھی اس جگہ سے دریا عبور نہیں کیا؟"

ملاح نے جواب دیا "مہاراج! ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی اس طرف کشتی لانے کی جرأت نہیں کی۔ سنا ہے کہ راجہ گوبند رام کے سینا پتی نے ان لوگوں پر سردیوں کے موسم میں چڑھائی کی تھی لیکن انہوں نے کئی کشتیاں چٹانوں سے پتھر پھینک کر ہی غرق کر دی تھیں۔ سینا پتی جی ان لوگوں کو سزا دینے کے لیے ایک مہینہ پہاڑوں میں پھرتے رہے اور آخر کار پانچ عورتوں، تین بچوں اور دو بوڑھوں کو جن میں سے ایک اندھا تھا قید کر کے لے گئے۔"

رام داس نے کہا "یہی وجہ ہے کہ ہم گرمیوں میں دریا عبور کر رہے ہیں۔"

مہاراج! گرمیوں میں پتھروں کا وزن کم تو نہیں ہو جاتا۔"

رام داس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "سردیوں میں دریا کا پانی اتر جاتا ہے اور وہ لوگ ہمارے حملے کا خطرہ محسوس کر کے ہوشیار ہو جاتے ہیں لیکن گرمیوں میں وہ دریا کو ناقابلِ عبور سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔"

رام داس یہ کہہ کر دریا کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک دوسرے کنارے پر پہاڑیوں کے عقب سے کالے کالے بادل نمودار ہوئے اور آن کی آن میں دھوئیں کی طرح آسمان پر چھا گئے۔ برسات کی پُرنم ہوا کے چند جھونکے آئے اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بجلی چمکی۔ بادل گرجا اور

موسلادھار بارش ہونے لگی۔

بوڑھے ملاح نے آگے بڑھ کر کہا "مہاراج! آپ جھونپڑی میں آ جائیں!"

رام داس اٹھ کر ملاح کے ساتھ چل دیا۔

چند قدم کے فاصلے پر سرکنڈے کی جھونپڑی کے پاس سفید رنگ کا ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ بوڑھے ملاح نے جلدی سے اپنی چادر اتار کر گھوڑے پر ڈال دی لیکن رام داس نے کہا اپنی چادر اتار لو۔ یہ اسے بھیگنے سے نہیں بچا سکتی۔"

ملاح اپنے ایثار کا ثبوت دینے پر تلا ہوا تھا لیکن ہوا کے ایک تند جھونکے نے چادر کو گھوڑے کی پیٹھ سے اڑا کر دس پندرہ قدم کے فاصلے پر پھینک دیا۔ بوڑھا ملاح چادر کے تعاقب میں بھاگا اور رام داس ہنستا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ باقی ملاح سمٹ کر ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ ایک ملاح نے اپنی چادر زمین پر بچھا دی۔ رام داس ابھی بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک ملاح جو دروازے میں کھڑا باہر جھانک رہا تھا، چلایا "وہ آ گئے! وہ آ گئے! راجہ کی فوج آ گئی!!!"

رام داس اور ملاح جھونپڑی سے نکل کر بارش میں کھڑے ہو گئے۔

سکھدیو، راجہ کی فوج کا سینا پتی مشکی رنگ کے ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار تھا اور چار سو کے قریب پیادہ سپاہی دو لمبی قطاروں میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سکھدیو نے گھوڑا روکا۔ بوڑھے ملاح نے بھاگ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔ سکھدیو گھوڑے سے اترا۔ رام داس نے آگے بڑھ کر پرنام کیا۔

سکھدیو نے پوچھا "کشتیاں پہنچ گئیں؟"

رام داس نے جواب دیا "جی ہاں۔"

"کتنی ہیں؟"

"سات ہیں۔ لیکن ایک ذرا ٹوٹ گئی ہے۔"

"ملاحوں کا مکھیا کون ہے؟"

بوڑھے ملاح نے جلدی سے گھوڑے کی باگ دوسرے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا "حکم مہاراج!"

"ایک پھیرے میں کتنے آدمی پار لے جاؤ گے؟"

"مہاراج! ایک کشتی میں چالیس آدمی جا سکتے ہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"مہاراج! بارش تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں، ذرا آگے بڑھ کر دریا کی روانی بھی دیکھ لیجیے۔ ایسے وقت میں دریا عبور کرنا بہت مشکل ہے۔ دریا کا یہ حصّہ بہت خطرناک ہے جگہ جگہ پانی میں چھپی ہوئی چٹانیں کشتیوں کے پرخچے اڑا دیتی ہیں۔ دوسرے کنارے پر کشتی لگانے کے لیے صرف ایک چھوٹا سا گھاٹ ہے جو اس وقت بارش کی وجہ سے نظر بھی نہیں آتا۔ اگر ہماری کشتی وہاں پہنچ گئی تو خیر، ورنہ نیچے کی طرف دور دور تک بلند چٹانیں ایک دیوار کی طرح کھڑی ہیں، وہاں کشتی لگانے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آپ بوڑھے آدمی کی بات مانیں، ایک دو دن انتظار کریں۔ اگر آج بارش تھم گئی تو پرسوں تک پانی اتر جائے گا۔"

سکھدیو نے کہا "پرسوں تک! میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے آج ہی دریا عبور کرنا ہے۔"

"مہاراج! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن خطرہ بہت ہے۔ اگر آپ اپنی ہی مرضی برتنا چاہتے ہیں تو کم از کم میری ایک بات ضرور مان لیجیے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم کشتیاں اپنے گھاٹ پر واپس لے جاتے ہیں۔ کل تک ہم وہاں

پہنچ جائیں گے اور وہاں سے آپ کو دریا کے پار پہنچا دیں گے۔"

سکھدیو نے بڑے کرخت لہجے میں جواب دیا "تم یا خود بے وقوف ہو یا ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر اس جگہ سے دریا عبور کرنا ہوتا تو ہمیں اتنی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ دشمن سے اگر ہمیں یہ امید ہوتی کہ وہ مقابلے کے لیے میدان میں آئے گا۔ تو ہم بیس کوس تو کیا چالیس کوس نیچے جا کر دریا عبور کرتے لیکن ہمارا دشمن شیر نہیں جو سامنے آ جائے، بلکہ خرگوش ہے جو ہماری آہٹ پاتے ہی کوسوں دور بھاگ جاتا ہے۔ سوئے ہوئے خرگوش کو جگا کر پکڑنے کی کوشش کرنا بے وقوفی ہے۔ اس جگہ سے دریا عبور کر کے ہم خرگوش کو نیند کی حالت میں پکڑ سکیں گے۔"

"مہاراج! خرگوش پکڑا جائے یا بھاگ جائے ہمیں تو آپ کا حکم ماننا ہے اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں آپ سے آخری بار کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

سکھدیو فطرتاً مغرور نہ تھا لیکن اسے سیناپتی کے عہدے پر فائز ہوئے صرف بیس دن ہوئے تھے اور ان بیس دنوں میں وہ زیادہ تر یہی سوچا کرتا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ نرم دل ہے۔ ایک سپاہی کو اتنا نرم دل نہیں ہونا چاہیے چنانچہ بعض اوقات وہ ان سپاہیوں کو جو اس سے بہت زیادہ بے تکلف تھے مرعوب کرنے کے لیے بگڑنے کی کوشش کرتا۔ اپنے خوبصورت چہرے کو جو ہر وقت مسکرانے کے لیے بنایا گیا تھا خواہ مخواہ غضب ناک بنا لیتا لیکن اس کی اصلی فطرت اس کے ارادوں پر غالب آ جاتی اور وہ اپنے مضبوط ارادوں کے باوجود یہ بھول جاتا کہ وہ سیناپتی ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے اپنے پرانے دوستوں کو سخت سست کہتا لیکن تنہائی میں انہیں بلا کر تسلی دیتا اور کہتا "کیوں بھئی! خفا ہو گئے۔ اتنی سی بات پر خفا ہو گئے؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں سیناپتی بن

کر مغرور ہو گیا ہوں۔ نہیں تمہارا خیال غلط ہے۔ میں وہی سکھدیو ہوں۔ اس وقت میں کسی اور خیال میں تھا۔"

یہی وجہ تھی کہ بوڑھے ملاح کو بے وقوف کہنے کے بعد سکھدیو نے اُسے تسلی دینا اپنا فرض سمجھتے ہوتے اس جگہ سے دریا عبور کرنے کے متعلق اپنے اغراض و مقاصد کی پُوری پُوری تشریح کر دی لیکن جب اس نے خرگوش کے پکڑے جانے کے متعلق بے اعتنائی ظاہر کرنے کے بعد ایک نیا مشورہ دینے کی اجازت طلب کی تو سکھدیو نے اس کے الفاظ سے زیادہ رام داس کی مسکراہٹ سے اندازہ لگایا کہ سیناپتی کا وقار خطرے میں ہے اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "بکو کیا بکتے ہو؟"

بوڑھا ملاح سکھدیو کے لہجے میں اس فوری تغیر کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "مہاراج! ہم آپ کے نوکر ہیں آپ خفا کیوں ہوتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں کُود پڑیں۔ ہمیں اپنی جان کی پروا نہیں لیکن آپ کے سپاہیوں کی جان بہت قیمتی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر آپ اسی وقت دریا عبور کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ایک کشتی جانے دیجئے۔ اگر وہ صحیح سلامت پہنچ گئی تو باقی بھی پہنچ جائیں گی۔ ملاح بھی تھوڑے ہیں۔ ہم ایک کشتی پہنچا کر تین کشتیاں ڈالیں گے۔ تین چار پھیروں میں آپ کی ساری فوج پہنچ جائے گی۔"

سکھدیو نے محسوس کیا کہ اس دفعہ بوڑھے ملاح پر اس کا غصہ قطعاً بے محل تھا۔ اس نے ندامت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا ایک کشتی پر کتنے آدمی سوار ہو سکیں گے؟"

"مہاراج! پہلے پھیرے میں صرف بیس آدمی ہوں تو بہتر ہو گا۔"

سکھدیو نے رام داس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "رام داس! فوج سے بیس

چیدہ سپاہی علیحدہ کرو۔"

"ابھی؟"

"اور کب؟ دریا عبور کرنے کے لیے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے! ہم دشمن کو بھاگنے کا موقع نہیں دینا چاہتے۔ میں رات کے وقت دریا عبور کرنا چاہتا تھا لیکن اب دیوتاؤں کی کرپا سے بارش شروع ہو گئی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں خود پہلی کشتی پر جاؤں گا۔ اگر ہم پہنچ گئے تو باقی سپاہیوں کو کشتیوں میں سوار کرا دینا ورنہ فوج لے کر واپس چلے جانا۔"

رام داس نے جواب دیا۔ "سیناپتی کا حکم ماننا میرا دھرم ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خطرے کے وقت آپ آگے جائیں اور میں پیچھے رہوں۔ پہلی کشتی پر مجھے جانے دیجئے۔ آپ فوج کی پشت پناہ ہیں۔ آپ کی جان ملک کے لیے بہت قیمتی ہے۔"

سکھدیو نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رام داس کے کندھوں پر رکھ دیئے اور بولا:

"رام داس! تم جانتے ہو کہ راجہ کے دربار میں اس مہم کو سر کرنے کے لیے کسی کو میری تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ میں اپنی ذمہ داری پر اس مقام سے دریا عبور کر رہا ہوں۔ اگر میں کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں تو گنگا رام اور اس کے ساتھی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکیں گے کہ میں تجربہ کار نہ تھا لیکن کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو گی کہ میں بزدل تھا۔ اگر میں خود پیچھے رہوں اور کشتی کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو دربار میں کوئی آواز میرے حق میں نہیں ہو گی۔ میں سب کی نظروں سے گر جاؤں گا اور سیناپتی بننے کے متعلق گنگا رام کے خواب پورے ہو جائیں گے۔ اب ہمیں جلدی چلنا چاہیے اگر بارش تھم گئی تو ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

(۲)

کشتی کا رسا کھولا گیا اور ملّاح جل کی دیویوں اور دیوتاؤں کا نام لے لے کر لمبے لمبے بانسوں کے ساتھ کشتی کھینے لگا۔ بوڑھا ملاح کشتی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگ بھاگ کر ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ بارش ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔

کشتی ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ پانی کا بہاؤ اسے نیچے کی طرف کھینچنے لگا۔ ملاح اپنی انتہائی طاقت صرف کرنے کے بعد کشتی کو چند گز اوپر لے جاتے لیکن پانی کی تیزی پھر غالب آ جاتی اور کشتی کئی گز نیچے چلی جاتی۔ بوڑھا ملاح گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ سکھدیو بظاہر اطمینان کے ساتھ دریا کی لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا تاہم بوڑھے ملّاح کی چیخ پکار اسے کبھی کبھی پریشان کر دیتی۔ منجدھار میں پہنچ کر ملاح زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جل کے دیوتاؤں کو مدد کے لیے پکارنے لگے۔ کشتی کو اب اوپر دھکیلنا تو درکنار سیدھا لے جانا بھی دشوار تھا۔ ملاحوں کی چیخ پکار سے سپاہیوں کے دل ڈوبے جا رہے تھے۔ سکھدیو ان کے مغموم چہرے اور سہمی ہوئی نگاہیں دیکھ کر بوڑھے ملاح کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے اضطراب کو چھپانے اور چہرے کو شگفتہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "ہماری کشتی کہاں لگے گی؟"

بوڑھے ملاح نے ہاتھ سے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "مہاراج ادھر دیکھیے! دو چٹانوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گھاٹ ہے۔ کشتی وہاں نہ پہنچ سکی تو نیچے کی طرف کئی کوس تک کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہم کشتی لگا سکیں۔ اس کنارے کے ساتھ ساتھ پانی کا بہاؤ بہت تیز ہے اگر ہم

نے کشتی واپس موڑنے کی کوشش بھی کی تو بھی ہمیں کافی دور تک نیچے جانا پڑیگا راستے میں کئی ایسی چٹانیں ہیں جو پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتیں اور کشتی کے لیے بہت خطرناک ہیں۔"

سکھدیو یہ سن کر خاموش ہو گیا اور بوڑھا ملاح پھر اپنی چیخ پکار میں مصروف ہو گیا۔

کشتی دو دفعہ بھنور میں پھنسی اور ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ بارش تھم چکی تھی اور گھاٹ بہت قریب نظر آ رہا تھا لیکن ملاحوں کے چہروں پر اطمینان کے آثار اب بھی نہ تھے۔ بوڑھا ملاح بدستور چلّا چلّا کر کنارے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ملّاح تھک کر چور ہو چکے تھے اور ان میں سے اکثر پانی کے مقابلے میں اپنی شکست کا اعتراف کر رہے تھے۔ کشتی آہستہ آہستہ کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بوڑھے ملاح کا گلا بیٹھ چکا تھا لیکن منزلِ مقصود قریب دیکھ کر وہ اپنی پوری طاقت سے چلّایا۔

"شاباش بہادرو! ہم پہنچ گئے۔ ہمت کرو۔ ہمت کرو۔"

ملاحوں نے اپنی رہی سہی طاقت کے ساتھ کشتی کنارے لگانے کی کوشش کی لیکن پانی کا ایک زبردست ریلا آیا اور کشتی چند گز نیچے چلی گئی۔ بوڑھے ملّاح نے اضطراری حالت میں اپنی پگڑی اتار کر دریا میں پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔ ملاحوں نے کشتی روکنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ ان کی کوشش بے سود تھی۔ ان کے سامنے گھاٹ کی بجائے مہیب چٹانیں ایک دیوار کی طرح کھڑی تھیں۔ جوں جوں کشتی گھاٹ سے دور جا رہی تھی یہ چٹانیں زیادہ خوفناک نظر آتی تھیں۔

تھکاوٹ اور مایوسی کی وجہ سے ملاحوں کی ہمت جواب دے چکی تھی اور ان کے ہاتھوں میں بانسوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

کشتی ایک خطرناک رفتار سے کنارے کے ساتھ ساتھ بہہ رہی تھی اور بوڑھا ملاح کشتی کے اگلے سرے پر کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ دہشت زدہ ہو کر چلّایا "چٹان... چٹان!... ہوشیار! ...... ہوشیار!!"....

سکھدیو نے غور سے پانی کی طرف دیکھا۔ اسے پانی کی سطح سے اوپر ایک پتھر کی نوک کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ملاحوں نے فوراً کشتی کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن پانی کی تیزی نے کشتی کو چٹان کی زد سے باہر نہ نکلنے دیا۔ کشتی چٹان کی سطح سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری۔ سکھدیو نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ملاح یک زبان ہو کر شور مچانے لگے۔

"کشتی ٹوٹ گئی! کشتی ڈوب رہی ہے! اپنی جان بچانے کے لیے تیار ہو جاؤ!"

کشتی کے پیندے میں شگاف ہو چکا تھا اور پانی ایک فوارے کی طرح اچھل اچھل کر اندر آ رہا تھا۔ بوڑھا ملاح سکھدیو کی طرف دیکھ کر چلّایا۔

"مہاراج! کشتی ڈوب رہی ہے۔ ناتھو، شمبھو، کالو! مہاراج کی جان بچاؤ!"

سکھدیو نے اپنا ترکش اور کمان دریا میں پھینکتے ہوئے کہا:

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔" یہ کہنے کے بعد وہ تلوار اٹھا کر پھینکنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن کسی خیال سے رک گیا۔

سپاہی سہمی ہوئی نگاہوں سے کبھی کشتی میں جمع ہونے والے پانی اور کبھی سکھدیو کی طرف دیکھتے۔ سکھدیو نے مغموم لہجے میں کہا۔

"سماج کے بہادرو! بھگوان کی یہی مرضی تھی۔ سماج کی سیوا کے لیے ہمارے بزرگ بڑی بڑی قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ موت کے ڈر سے تمہارے چہرے مغموم نہیں ہونے چاہئیں۔ تمہاری رگوں میں بہادروں کا خون ہے۔ ہمت اور استقلال سے کام لو۔ پانی کی لہریں دیکھ کر ہمت نہ ہارو۔ میں جانتا ہوں کہ اب واپس جانا بہت مشکل ہے۔ ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اس کنارے کے ساتھ ساتھ تیرتے چلیں۔ ان چٹانوں میں کہیں نہ کہیں باہر نکلنے کا راستہ ضرور ہوگا کنارے پر پہنچ کر تمہیں شاید دشمن کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لیے تلواریں پاس رکھو باقی ہتھیار پھینک دو۔ جو تیرنا کم جانتے ہوں وہ تلواریں بھی پھینک دیں۔ ملاحوں میں سے جو دوسرے کنارے پر جانے کی ہمت رکھتے ہیں وہ واپس جا سکتے ہیں۔"

بوڑھا ملاح چلّایا۔

"کشتی جا رہی ہے۔ جا رہی ہے! ہوشیار! ہوشیار!!"

---

(۳)

سکھدیو دوسرے سپاہیوں اور ملاحوں کی طرح اپنی جان بچانے کے لیے پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ ملاحوں نے فرداً فرداً سکھدیو کے قریب پہنچ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن اس طوفان میں بڑے سے بڑے تیراک کے لیے اپنی جان بچا کر نکل جانا بھی بڑی بات تھی۔ سکھدیو کی جوانمردی اور غیرت نے کسی کی مدد لینا گوارا نہ کیا۔

ملاح دوسرے کنارے کا رخ کر چکے تھے لیکن سپاہیوں میں سے کسی

کو ان کی تقلید کی ہمت نہ ہوئی۔ پانی کی لہروں نے سپاہیوں کو منتشر کر کے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا۔ جو تیرنا نہیں جانتے تھے چند بار ہاتھ پاؤں مار کر چیختے چلاتے پانی کی آغوش میں روپوش ہو گئے۔ دریا کے بہاؤ کا سارا زور کنارے کی ناقابلِ عبور چٹانوں کے ساتھ ساتھ تھا۔ پانی کے پیہم تھپیڑوں نے بعض چٹانوں کے نچلے حصوں میں بڑے بڑے خلا پیدا کر دیئے تھے اور ان مقامات پر نہایت خوفناک بھنور پیدا ہو رہے تھے۔

سکھدیو اور اس کے چند ساتھی ایک بھنور میں پھنس گئے۔ سکھدیو انہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر زبردست جدوجہد کے بعد بھنور سے باہر نکلا۔ اتنی دیر میں اس کے دوسرے ساتھی بہت دور جا چکے تھے۔ کچھ دیر اور تیرنے کے بعد سکھدیو ایک اور بھنور میں پھنس گیا مگر پانی کا چکر اسے زبردستی کھینچ کر کنارے کی طرف لے گیا۔ چٹان میں ایک جگہ پانی کی سطح کے برابر ایک نوکدار پتھر ابھرا ہوا تھا۔ سکھدیو نے اس پتھر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ لیکن وہ دم نہ لینے پایا تھا کہ اٹھتی ہوئی لہروں کے چند تھپیڑوں نے یہ عارضی سہارا بھی اس کے ہاتھوں سے چھین لیا اور پھر وہ اسی خوفناک بھنور میں چکر کھانے لگا۔ کئی غوطے کھانے کے بعد سکھدیو ادھ موا سا ہو کر بھنور کے چکر سے باہر نکلا اور دریا کے کھلے پانی میں تیرنے لگا۔

سکھدیو میں اب ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت نہ تھی۔ اس کا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن اپنے ساتھیوں میں سے اسے کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف پانی کی سرکش موجیں موت کا مہیب راگ الاپ رہی تھیں۔ انتہائی مایوسی کی حالت میں زندہ رہنے کی خواہش نے تھوڑی دیر کے لیے اس کی نیم مردہ رگوں میں ایک نئی

حرارت پیدا کر دی۔ اس رنگ و بو کی دنیا میں چند سانس اور لینے کی تمنا سماج کے مستقبل کو شان دار بنانے اور سماج کے پروہت کو خوش کرنے کے لیے اپنی جان قربان کر دینے کی مقدس خواہش پر غالب آ گئی۔ ایک لمحہ کے لیے اس دنیا کی تمام رنگینیاں اور دل فریبیاں جو زمین کے ذروں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بکھر گئیں۔ سکھدیو نے آسمان کی طرف دیکھا اور درد بھری آواز میں چلایا۔

"بھگوان ـــ! بھگوان ـــ! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی جوان ہوں۔ تیرے دیوتاؤں کو میری ضرورت ہے بھگوان! . . . . بھگوان!!"

سکھدیو کی آواز دریا کے ہنگامے میں فنا ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور ان آنسوؤں کے ساتھ اس کی رہی سہی ہمت بھی رخصت ہو گئی۔ جب تک ہوش رہا وہ آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ بعض اوقات پانی کی لہریں اسے اپنے دامن میں چھپا لیتیں اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا اوپر ابھر آتا۔

دیر تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد سکھدیو کی آنکھوں کے سامنے سیاہی طاری ہونے لگی اور اس کے کانوں سے دریا کی موجوں کا شور محو ہونے لگا۔

---

(۴)

ہوش آنے پر سکھدیو کو چند غیر مانوس آوازیں سنائی دیں۔ اس نے آنکھیں

کھولیں اور اپنے ارد گرد چند اجنبی صورتیں دیکھ کر پھر بند کر لیں۔ گزشتہ واقعات ایک لمحہ کے اندر اندر اس کی آنکھوں میں پھر گئے۔

"کیا میں زندہ ہوں؟" یہ سوچتے ہی اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور بدحواس ہو کر تماشائیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے اچانک یہ محسوس کیا کہ وہ انتہائی بے چارگی کی حالت میں ان لوگوں کے درمیان پڑا ہوا ہے جو اس کے بدترین دشمن تھے لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کے چہرے نفرت اور حقارت کی بجائے ہمدردی اور تشویش ظاہر کر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق اس کا انصاف پسند راجہ اور پروہت یہ حکم صادر فرما چکے تھے کہ ان کی جھونپڑیاں جلا دی جائیں اور انہیں سخت سے سخت اذیتیں دے کر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی سرسبز چراگاہوں کو چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں۔

یہ وہ لوگ تھے جنہیں نزدیک سے دیکھنا، جن کے ساتھ ہم کلام ہونا، جن کی آواز سننا اور جن کو چھونا وہ ایک بدترین پاپ سمجھتا تھا۔ جنہیں سماج کا قانون اچھوت قرار دے چکا تھا۔ جن کے ساتھ ظلم کرنا اس کا پیدائشی حق تھا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن سکھدیو ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھا۔ انہیں کی بوسیدہ جھونپڑی میں ایک پھٹے پرانے بستر پر لیٹا ہوا وہ ان کی شکلیں دیکھ چکا تھا۔ ان کے منہ سے نکلی ہوئی آوازیں سن چکا تھا۔ ان کی چھوئی ہوئی چیزیں چھو چکا تھا۔ ہر لحظہ اس کے دھرم کی دولت لٹ رہی تھی۔ سماج کے خوف سے اس کا دل کانپنے لگا۔

جسم میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ وہاں سے بھاگ اٹھتا۔ اسے ایک بہادر

سپاہی کی طرح اپنی جان کا خوف نہ تھا لیکن اتنی بری جگہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں مارا جانا اسے گوارا نہ تھا۔

تماشائی اس کے متعلق عجیب و غریب باتیں کر رہے تھے۔ ایک نوجوان بھاگتا ہوا جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور اس نے کہا:

"راستہ چھوڑو" سردار آتا ہے۔" تماشائی جھونپڑی کے کونوں میں سمٹ گئے۔

ایک بوڑھا شخص لاٹھی ٹیکتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بلند قامت لڑکی تھی۔ بوڑھا سردار سکھدیو کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی جان اس بوڑھے شخص کے قبضہ میں ہے سکھدیو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے آنکھیں پھیر لیں۔

بوڑھے سردار نے پوچھا "آپ کون ہیں؟"

سکھدیو نے اس سوال کے جواب میں پھر ایک بار سردار کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

سردار نے پھر کہا "آپ اونچی ذات کے سپاہی معلوم ہوتے ہیں یہاں کیسے پہنچے؟"

سکھدیو کی خاموشی پر ایک شخص نے جواب دیا "مہاراج! یہ دریا میں ڈوب رہا تھا ہم نے بڑی مشکل سے نکالا تھا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔"

یہ کہہ کر سردار سکھدیو کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ اطمینان سے یہاں پڑے رہیں آپ بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صبح تک آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

ہم دریا کا پانی اترتے ہی آپ کو پار پہنچا دیں گے۔"

سکھدیو کی پریشان صورت پر قدرے اطمینان کے آثار پیدا ہوئے لیکن سردار کے منہ سے تسلی کے چند کلمات ان ہزاروں کہانیوں کی تردید نہ کر سکے جو ان لوگوں کی وحشت اور بربریت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے سماج کے اونچے ایوانوں میں بیان کی جاتی تھیں اور جنہیں سکھدیو کے کان بچپن سے سنتے آئے تھے۔

اس کے دل کی آواز نے اپنا تسلی آمیز لہجہ بدل کر کہا یہ لوگ! یہ ناپاک لوگ! رحم کے لفظ سے آشنا نہیں۔ یہ تجھے زیادہ سے زیادہ المناک سزا دینے سے پہلے تیری حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ تیرے دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تجھے آگ میں ڈالنے سے پہلے ایک خیالی جنت کی سیر کروانا چاہتے ہیں۔ انتہائی بے کسی کی حالت میں تماشائیوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے اور سردار کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد اس کی نگاہیں اس نوجوان لڑکی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جو سردار کے قریب کھڑی تھی۔

سکھدیو نے اچانک یہ محسوس کیا کہ ان ناپاک، مفلس اور نادار لوگوں کے درمیان ایک ایسا وجود بھی ہے جو سماج کی حسین پریوں سے مشابہت رکھتا ہے اس کا لباس دوسری عورتوں سے ستھرا تھا۔ اس کے چہرے پر صبح کاذب کے دھندلکے اور صبح صادق کی سپیدی کی آمیزش سے پیدا ہونے والی ایک دلفریب جھلک تھی۔ اس کے خدوخال میں غایت درجہ کی سادگی، بھولا پن اور جاذبیت تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ستاروں کی چمک اور شب کی سیاہی تھی لیکن ان میں شوخی سے زیادہ سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ مضبوط اور سڈول جسم جنسِ لطیف کی نزاکت سے زیادہ نسوانی رُعب اور وقار کا آئینہ دار تھا۔ غرض وہ جمالِ انسانی کا ایک ایسا سادہ اور دلفریب مجموعہ تھی، جو پہلی نگاہ میں جاذبِ توجہ اور دوسری

نگاہ میں دل فریب نظر آنے لگے۔

سکھدیو کے سامنے ایک ایسی تصویر تھی جو آنکھوں کو خیرہ کر کے دل میں ایک ہنگامی تلاطم برپا نہیں کرتی بلکہ غیر شعوری طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر کر ہلکے دھیمے اور میٹھے سُروں میں ایک ایسا راگ چھیڑتی ہے، جس کی تانیں وقت کی رفتار کے ساتھ بلند ہوتی رہتی ہیں اور بالآخر دل و دماغ کی تمام وسعتوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ لیکن سکھدیو کے ضمیر پر مقدس سماج کا بیٹا ہونے کا احساس کچھ اس طرح غالب تھا کہ وہ اس دوشیزہ کی طرف ایک نظر سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ اچھوت لڑکی کے اپوتر ہونے کا احساس نگاہوں کی تشنگی پر غالب آگیا۔

سردار نے کہا "ایسے موسم میں آپ دریا میں کیوں کودے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اچھے تیراک ہیں، ورنہ اونچی ذات کے لوگ بیاس کے تیز اور گہرے پانی سے آجکل دُور ہی رہتے ہیں۔"

سکھدیو نے سردار کی طرف دیکھا۔ دل نے زبان کو کچھ کہنے کی دعوت دی لیکن وہ اُلجھے ہوئے خیالات کی ترجمانی سے قاصر رہا۔ بوڑھے سردار نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ حوصلہ کیجیے! ان لوگوں میں آپ کا کوئی دشمن نہیں۔ آپ کے راجہ کے بہادر سپاہی کئی بار ہمیں لوٹنے، ہماری جھونپڑیاں جلانے اور ہمیں غلام بنانے کی نیت سے اس زمین پر اپنے پوتر پاؤں رکھ چکے ہیں لیکن یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں۔ اب آپ شاید پہلے آدمی ہیں جنہیں ہماری جنم بھومی میں ایک مہمان کی حیثیت سے قدم رکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اگرچہ ہم اس قابل نہیں کہ آپ کی پوری پوری تواضع کر سکیں لیکن آپ اطمینان رکھیں۔ ہماری جان و مال سے کوئی شے بھی آپ کے پوتر پاؤں کی مٹی سے زیادہ عزیز نہیں سمجھی جائے گی۔"

سردار نے لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا "تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں صحیح ہے" اور اس نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے سکھدیو کے پاؤں چھو لیے۔ سکھدیو ابھی تک تم کی بجائے آپ کہہ کر مخاطب کیے جانے پر ہی حیران تھا۔ سردار کی اس غیر متوقع حرکت کے بعد وہ اپنے دل پر ندامت کا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرنے لگا۔ اس کے جی میں آئی کہ اس جھونپڑی میں جس کا ہر تنکا اسے نفرت سے گھور رہا تھا اٹھ کر بھاگ جائے اور پھر اسی دریا میں چھلانگ لگا دے لیکن جسم میں اتنی طاقت نہ تھی وہ انتہائی اضطراب کی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لوگ اپنے سردار کی تقلید میں یکے بعد دیگرے اس کے پاؤں چھونے لگے۔ لیکن ان کے ہاتھوں کا لمس اس کے پاؤں کے لیے جلتے ہوئے انگاروں سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ سکھدیو کے ضمیر نے بلند آواز میں کہا "کاش! یہ بوڑھا ان میں سے ہر ایک کو باری باری میرے پاؤں چھونے کی بجائے میرے سینے کو تیز خنجروں سے چھلنی کرنے کا حکم دیتا۔"

جب تمام لوگ سردار کے حکم کی تعمیل کر چکے تو اس نے نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا "بیٹی کنول! تم کیا سوچ رہی ہو۔ مہمان کی عزت کا فرض سب سے زیادہ اس بدنصیب قوم کے سردار کے گھرانے پر عائد ہوتا ہے۔"

نوجوان لڑکی ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی۔ سکھدیو کی طرف حیا، مسرت اور گھبراہٹ میں کھوئی ہوئی ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا جھکی، سکھدیو کے پاؤں پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا اور دھڑکتے ہوئے دل کو تھامے، آنکھیں جھکائے سمٹتی ہوئی سردار کے قریب آ کھڑی ہوئی، ایک لمحہ کے لیے اس کی تمام رگوں کا خون سمٹ کر گالوں میں آگیا اور پھر کچھ دیر سرخ اور سفید لہریں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی رہیں۔ ایک برقی لہر سکھدیو کے پاؤں سے اس کے دل اور دل سے دماغ تک پہنچی۔ لیکن

سماج کے مغرور بیٹے نے اپنے دل میں کسی لطیف خیال کو جگہ نہ دی۔

شام ہو چکی تھی۔ سردار نے چند آدمیوں کے سوا باقی تمام کو اپنے اپنے گھروں کی راہ لینے کا حکم دیا اور سکھدیو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ محلات میں رہنے والے ہیں۔ شاید اس بدبودار جھونپڑی میں آپ کو نیند نہ آسکے اور یہاں گرمی بھی ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو آپ کے سونے کا انتظام باہر کر دیا جائے۔ بادل چھٹ چکے ہیں اور باہر ہوا بہت اچھی ہے۔"

سکھدیو جواب دیئے بغیر اٹھا اور سردار کے پیچھے چل دیا۔ ایک شخص نے باہر کھلے میدان میں چارپائی لا کر ڈال دی۔ سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ آرام کریں! میرے آدمی آپ کی حفاظت کا خیال رکھیں گے۔"

سکھدیو ہچکچاتا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سردار نے چند آدمیوں کو رات بھر پہرہ دینے کا حکم دیا۔ آٹھ دس آدمی سکھدیو کے ارد گرد بھیگی ہوئی گھاس پر بیٹھ گئے سکھدیو کا پریشان ضمیر بلند آواز میں پکار اٹھا۔ "یہ بہت زیادتی ہے میں رات بھر اتنے آدمیوں کو تکلیف دینے کا حق دار نہیں۔"

اس دل میں جسے سماج کی تربیت ان لوگوں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت بنا چکی تھی۔ رحم کی کوئی دبی ہوئی چنگاری جاگ اٹھی اس نے سوچا "اگر میں اپنی پوری جماعت کے ساتھ دریا عبور کر لیتا تو ان سادہ لوح انسانوں کا کیا حشر ہوتا! یہ لوگ اس قدر بدنام کیوں ہیں! ہمارے ملک کے سماج نے انہیں انسانوں کا درجہ کیوں نہیں دیا! یہ میرے ساتھ اس قدر شرافت سے پیش کیوں آئے؟ میرے پاؤں چھونے کی بجائے انہوں نے میری بوٹیاں کیوں نہ نوچ ڈالیں، اگر مجھے ان کے ساتھ دشمنی کا فطری حق ہے تو مجھ میں کون سی ایسی خوبی ہے جو ان لوگوں کے رحم کا مستحق بناتی ہے؟" اس نے چاند کی روشنی میں بوڑھے سردار کی طرف دیکھا اور اس

کے چہرے پر شفقت، مروت اور ہمدردی کے آثار دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔

سردار نے کہا "اچھا میں جاتا ہوں۔ آپ کو اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو ان آدمیوں میں سے کسی کو میرے پاس بھیج دیں۔"

سردار زیادہ دُور نہ گیا تھا کہ سکھدیو نے چارپائی سے اٹھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ٹھہریے!"

سردار نے واپس مڑ کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

سکھدیو نے کہا "مجھے ان آدمیوں کے درمیان نیند نہیں آئے گی۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ . . میں تنہا رہنا چاہتا ہوں آج کی رات . . . !"

سردار نے قریب آ کر جواب دیا "اگر آپ جانا چاہیں تو آپ کو کون روک سکتا ہے اگر دریا کی یہ حالت نہ ہوتی تو میں شاید آج ہی آپ کو پار پہنچا دیتا۔ آپ کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ آپ ہماری قید میں ہیں میں نے ان آدمیوں کو آپ کی خدمت میں اس لیے چھوڑا تھا کہ شاید آپ تنہائی میں سونے کے عادی نہ ہوں۔ شہر کے رہنے والے جنگلوں سے خوف کھاتے ہیں۔"

سکھدیو نے مغموم لہجے میں کہا "میں انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ آپ انہیں اپنے اپنے گھر جا کر آرام کرنے کا حکم دیں۔"

سردار کے اشارے سے تمام آدمی اٹھ کر اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ اس نے سکھدیو سے کہا "اس کام کے لیے مجھ سے کہنے کی ضرورت نہ تھی آپ خود انہیں حکم دے سکتے تھے۔ یہ سب مہمانوں کی سیوا کرنا جانتے ہیں اور آپ جیسے مہمانوں کی سیوا کرنے کا موقع بار بار نہیں ملتا۔"

سکھدیو کے دل پر ایک گہرا چرکا لگا اور وہ نڈھال سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ

گیا۔ سردار وہاں سے رخصت ہو کر تھوڑی دُور چلنے کے بعد اپنے مکان میں داخل ہوا۔ مکان کے وسیع صحن میں چند عورتیں باتیں کر رہی تھیں انہوں نے سردار کو دیکھتے ہی اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

---

(۵)

سردار کنول سے کچھ کہے بغیر صحن میں ایک چارپائی پر لیٹ کر گہرے خیالات میں کھو گیا۔ سردار کا نام ساون تھا اور وہ اس علاقہ میں جس کا کچھ حصہ میدانی اور زیادہ حصہ پہاڑی تھا۔ ان آزاد قبائل کا راہنما تھا جنہیں دریا کے پار اونچی ذات والوں کی سماج کا پروہت اچھوت قرار دے چکا تھا۔ یہ لوگ پنجاب کی ان قدیم اقوام سے تعلق رکھتے تھے جنہیں وسطی ایشیا کے آرین فاتحین کے پے در پے حملوں نے پنجاب کے وسیع میدانوں سے بھگا کر شمال مشرق کے دشوار گزار پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ آرین یا اونچی ذات کے لوگ مغلوب ہو جانے والے دشمنوں کو سماج کے شودر بنا چکے تھے لیکن پھر بھی ہزاروں لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی آزادی کی قیمت پر سماج کا قابلِ نفرت حصہ بننا گوارا نہ کیا۔ اور زرخیز میدانوں کو چھوڑ کر کانگڑہ اور کشمیر کے درمیان پھیلے ہوئے پہاڑوں میں آباد ہو گئے۔ میدانی علاقوں کے وہ آرین حکمران جن کی ریاستوں کی حدود ان پہاڑی علاقوں سے ملتی تھیں اپنی اپنی شہرت اور ناموری کے لیے ان آزاد اقوام پر تسلط جمانے کے لیے انفرادی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک راجہ جس قدر پہاڑی علاقوں میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑتا اسی قدر وہ اپنی رعیت اور پروہتوں کی نظر میں قابلِ عزت خیال کیا جاتا۔ میدانی علاقوں کے راجوں کی طرح پہاڑی باغی اقوام کے بھی کئی سردار تھے۔ دُوسرے پہاڑی سرداروں

کی طرح ساون بھی ان چند قبائل کا راہنما تھا جنہیں آریں فاتحین کا غلام بننے سے نفرت تھی اور اس کے پڑوس میں میدانی علاقہ کا راجہ بھی ان چند راجاؤں میں سے ایک تھا جو سماج کی عزت اور اپنی شہرت و ناموری کے لیے ساون اور اس کی سرکش قوم کو مغلوب کر کے سماج کے شودر بنانا چاہتا تھا۔

اونچی ذات کے راجہ اور پروہت کے لیے یہ لوگ کسی خطرے کا باعث نہ تھے لیکن انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ انسانوں کا ایسا گروہ جسے ان کے دیوتا ٹھکرا چکے ہوں پہاڑوں کی سرسبز چراگاہوں پر قبضہ جما کر آسمان کی بارش اور زمین کی زرخیزی سے وہ فوائد حاصل کر سکے جو سماج کے طاقتور دیوتا فقط اونچی ذات کے انسانوں کے لیے مخصوص کر چکے تھے۔

لیکن اونچ ذات کی روحانی طاقت کا احترام اور ان کی جسمانی طاقت کا خوف پہاڑ میں رہنے والے سرکش لوگوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہ کر سکا۔

پڑوس کے راجہ کے آباؤ اجداد گزشتہ صدیوں میں یکے بعد دیگرے ان لوگوں پر اپنی طاقت آزما چکے تھے لیکن گھنے جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑوں میں قدرت نے ان بے دست و پا لوگوں کی پناہ کے لیے ہزاروں قلعے تعمیر کر دیے تھے۔ گزشتہ بارہ برس میں پڑوس کے راجہ کی طرف سے ان لوگوں پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس عرصہ میں حکومت کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ اپنے آباؤ اجداد کی ناکامیوں سے سبق حاصل کر چکے تھے اور یا شاید اس لیے کہ اونچی ذات والوں کا سماج خود ہی ایسے لوگوں کو انسانی حقوق سے محروم کرنے کا قدیم نظریہ بدل چکا تھا الغرض گزشتہ بارہ برس کے امن اور سکون نے ان لوگوں کو مطمئن کر دیا تھا اور یہ دریا کے پار نشو و نما پانے والے سماج کو ایک طاقتور لیکن پرامن ہمسایہ سمجھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

معمولی ضروریات کے لیے بعض لوگ کبھی کبھی دریا عبور کر کے سماج کی مقدس زمین میں بھی داخل ہو جاتے لیکن وہاں بھی ان کے تجارتی اور کاروباری تعلقات صرف ان قبائل تک ہی محدود تھے جو سماج کے جبر و استبداد کے سامنے سر جھکا کر پرامن شودروں کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ بعض نادانوں نے اونچی ذات کے مقدس ایوانوں کی زیارت کے شوق میں شہروں تک جانے کی جرأت کی لیکن ان میں ایسے خوش نصیب بہت کم تھے جنہیں ایسے خطرناک مقامات کی سیاحت کے بعد زندہ اپنے گھر لوٹنے کا موقع ملا۔ اس لیے ساون نے چند سال سے یہ حکم دے رکھا تھا کہ اس کی قوم کا کوئی آدمی دیوتاؤں کی مقدس زمین میں داخل نہ ہو لیکن پھر بھی بعض لوگ کبھی کبھی دریا عبور کر کے اسے بھر بھشٹ کر ہی آتے۔

ساون طبعاً شریف تھا اس کی سادگی اور تدبر نے قوم کے ہر بچے اور بوڑھے کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ گزشتہ چند برسوں سے زندگی کے پرسکون سمندر میں اپنی قوم کی کشتی کی پتوار سنبھالے ہوئے تھا۔ اس زمانہ میں اس بوڑھے ملاح کو کسی طوفان سے واسطہ نہ پڑا لیکن دریا کے پار سوئے ہوئے طوفان بارہ برس بعد پھر ایک بار ایک نوجوان راجہ اور ایک بوڑھے پروہت کی شخصیت میں جاگ اٹھے۔ نوجوان راجہ کو تخت نشین ہوئے دو سال اور پروہت کو اپنے منصب پر فائز ہوئے چھ مہینے نہ ہونے پائے تھے کہ دریا کے پار بسنے والے آزاد قبائل کے خلاف سماج کے دیوتاؤں کی دبی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی۔ بارہ برس کے بعد سکھدیو اونچی ذات والوں میں سے پہلا شخص تھا جس نے سماج کی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے شودروں کی اس ناپاک زمین کو اپنے پوتر چرنوں سے سرفراز کیا تھا۔

(۶)

سردار بستر پر لیٹا ہوا ان عجیب و غریب حالات میں اپنے مہمان کی آمد کے متعلق سوچ رہا تھا کنول اس کی اکلوتی بیٹی کچھ دیر چارپائی پر بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بالآخر وہ اٹھی اور ساون کے قریب آ کر بولی:

"باپو! آج آپ بہت پریشان ہیں کھانا لاؤں۔"

ساون نے کنول کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا "نہیں! مجھے بھوک نہیں۔"

کنول پھر بولی۔ "باپو! ۔ وہ مہمان شاید بھوکا ہو...... آپ نے اس کو کچھ کھانے کے لیے نہیں کہا۔"

سردار نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا "مجھے خیال تو آیا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اونچی ذات کے لوگ ہمارے ہاتھ کی کوئی چیز نہیں کھاتے۔"

"کیوں باپو؟"

"کنول! تو نہیں جانتی۔ ان کا دھرم انہیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔

اگر وہ مجبور نہ ہوتا تو ہماری چارپائی پر بھی نہ لیٹتا۔"

کنول نے کہا "باپو! اگر مجبوری اسے ہمارے بستر پر سلا سکتی ہے تو مجبوری کی حالت میں ہمارے ہاتھ کا کھانا لینے میں کیا برائی ہے۔ آپ پوچھ تو لیتے؟"

سردار نے جواب دیا "مجھے ڈر تھا کہ وہ ناراض ہو جائے گا اس لیے میں نے پوچھنے کی جرأت نہ کی۔"

کنول نے کہا "شاید وہ بہت بھوکا ہو اور ناراض نہ ہو۔"

کنول! ہمارے گھر کا کھانا کھا لینے میں اس کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا مہمان کا دھرم خراب کرنا میں پاپ سمجھتا ہوں اگر وہ بھوکا بھی ہو تو بھی میں اپنی

طرف سے اسے کھانے کی دعوت نہیں دے سکتا۔

"اگر وہ خود مانگ لے تو؟"

"تو پھر کوئی بات نہیں لیکن وہ مانگے گا نہیں۔"

"تو باپو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بیچارہ جب تک ہمارے پاس رہے گا، بھوکا رہے گا۔"

"کنول! تم اس کی اتنی فکر کیوں کرتی ہو۔ ہم صبح اسے دریا کے پار پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ جاؤ تم سو جاؤ!"

کنول مایوس ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئی اس نے آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہ آئی۔ عورت کی وہ فطرت جو کسی اجنبی سے صرف اس لیے دلچسپی لیتی ہے کہ وہ ایک پردیسی ہے اور اس کا پرسان حال کوئی نہیں ___ جو کسی تھکے ماندے مسافر کو دیکھ کر فوراً اس کی بھوک اور پیاس کا اندازہ لگاتی ہے ___ جو کسی زخمی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ لیتی ہے۔ کنول کو بار بار سکھ دیو کی بھوک کی شدت کا احساس کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

دیر تک چاند کے سامنے سے گزرنے والے ہلکے ہلکے بادلوں کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے بستر سے اٹھی۔ سردار گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ کنول دبے پاؤں مکان کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک ٹوکرے سے چند آم نکال کر جھولی میں ڈالے اور جھجک جھجک کر قدم اٹھاتی ہوئی مکان سے باہر نکل آئی۔

سکھ دیو کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ کنول کچھ دیر پریشانی کی حالت میں وہاں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اچانک چاند بادل کے نقاب سے باہر نکلا اور اس کی نگاہیں دور دور تک کام کرنے لگیں۔ سکھ دیو چند قدم کے فاصلے پر سر جھکائے آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا چارپائی کی طرف آ رہا تھا۔ کنول نے جلدی سے آم اس کے بستر پر ڈھیر کر دیے

اور واپس لوٹنے کو تھی کہ اچانک کسی خیال نے اُس کا راستہ روک لیا۔ جوں جوں سکھدیو قریب آ رہا تھا کنول کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ایک نامعلوم خوف اسے وہاں سے دھکیل کر گھر کی طرف لے جا رہا تھا اور ایک نامعلوم کشش اسے وہاں ٹھہرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

سکھدیو نے چارپائی کے قریب پہنچ کر اچانک کنول کی طرف دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس نے کنول سے کچھ کہے بغیر چارپائی پر لیٹ جانا چاہا لیکن وہاں آموں کا ڈھیر دیکھ کر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر تذبذب کے بعد اس نے کنول کی طرف دیکھا اور کہا "تم نے میرے لیے یہ تکلیف کیوں اٹھائی؟"

سکھدیو کے لب ولہجہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے وہ پریشان ہوتی وہ جرأت کر کے ایک قدم آگے بڑھی اور بولی "پتاجی کو ڈر تھا کہ آپ خفا ہو جائیں گے ...... اس لیے وہ آپ کو کھانے کی دعوت نہ دے سکے ... انہوں نے خود بھی کچھ نہیں کھایا ...... میں روٹی نہیں لائی ...... یہ آم ہیں .. اگر کہیں تو روٹی بھی لے آؤں اور دودھ بھی۔"

کنول کا ہر لفظ سکھدیو کے دل سے توہمات کے ہزاروں نقاب الٹ رہا تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس پُرسکون ماحول میں اس بھولی بھالی دوشیزہ کے الفاظ اس کے کانوں کو ہی مسحور نہیں کر رہے بلکہ ان کا خلوص درختوں کے پتوں اور آسمان کے ستاروں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔

اس نے کہا "نہیں۔ روٹی اور دودھ کی مجھے ضرورت نہیں۔ تم جا کر آرام کرو۔"

کنول نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "تو آپ آم کھا لیں گے ...." کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا حرج ہے ...... آپ شاید کل بھی دریا عبور نہ کر سکیں ..... شاید چند دن اور یہیں رہیں .... اتنے دن بغیر کچھ کھائے ...!"

سکھدیو نے پہلی دفعہ ایک لمحہ کے لیے غور سے کنول کی طرف دیکھا ..... اسے کنول کا سادہ اور معصوم چہرہ یہ کہتا ہوا دکھائی دیا "تم بھوکے ہو اگر تمہاری بھوک کا احساس نہ ہوتا تو میں اس وقت یہاں نہ آتی۔" سکھدیو نے محسوس کیا کہ دیوانی اچھوت لڑکی اسے مقدس سماج کا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کے لیے نہیں آئی بلکہ اس کی بیچارگی پر ترس کھا کر اس کو کھانے کی دعوت دینے کے لیے آئی ہے۔ سماج کا مغرور سپاہی زیادہ دیر اچھوت لڑکی کے سامنے گردن جھکا کر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ آم ایک طرف ہٹا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور کنول کچھ کہے بغیر اپنے گھر کی طرف چل دی۔

سکھدیو دیر تک چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اچھوت لڑکی کے ہاتھ لگ جانے کے باوجود آموں کی مہک میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ سکھدیو کی بھوک ناقابلِ برداشت تھی لیکن اس کے باوجود ذات کی برتری کا احساس آموں کی مہک پر قربان ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ سکھدیو نے ایک آم اٹھایا اور تصور کی آنکھیں سماج کے چہرے پر غم وغصہ کے آثار دیکھنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر آم وہیں رکھ دیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد پھر آموں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ اگر ان آموں کی قیمت فقط کسی پیٹ بھر لینے والی شئے پر قیاس کی جا سکتی تو سکھدیو نے کچھ سوچے اور بے قرار آنتوں کا مشورہ لیے بغیر انہیں اٹھا کر دور پھینک دیا ہوتا لیکن اچھوت لڑکی کے بھینٹ کئے ہوئے آم فقط آم نہ تھے۔ سکھدیو سپاہیانہ عزم کا مالک ہونے کے باوجود دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ضمیر کی ایک آواز اسے ہندو سماج کے احترام پر مجبور کر رہی تھی اور اس کی دوسری آواز کسی ایسے جذبے کے احترام کا سبق دے رہی تھی جس سے چند گھڑیاں قبل وہ قطعاً ناآشنا تھا۔ اس کے دل میں دیوتاؤں سے بگاڑ کی ہمت تھی نہ کسی معصوم دل کو ٹھوکر لگانے کا حوصلہ۔

بالآخر عقل نے فیصلہ صادر کیا کہ سماج کے دیوتا اس وقت بھی تیری حرکات

دیکھ رہے ہیں لیکن اس گنہ گار قوم کے سب افراد سو رہے ہیں۔ اس نے قدرے اطمینان کی حالت میں آم اپنی جھولی میں ڈالے اور ایک طرف چل دیا۔

---

(۷)

مینڈکوں اور جھینگروں کے ترانے بارش کے دیوتا سے مزید لطف و کرم کی تمنا کر رہے تھے۔ دریا کی لہریں بدستور بڑی بڑی چٹانوں کو سنگ ریزوں اور سنگ ریزوں کو ریت کے ذروں میں تبدیل کرنے کے قدیم مشغلے میں مصروف تھیں۔

سکھدیو جھولی میں آم لیے دریا کے کنارے ایک چٹان پر کھڑا اُس چور کی طرح جو چوری کا مال چھپانے کا ارادہ کر رہا ہو ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

سماج کا وہ بہادر بیٹا جس کی تربیت تیروں کی بارش اور تلوار کے سائے میں ہوئی تھی جسے برہمو سماج کے دشمنوں کی لاشوں کو روندنا اور ان کے خون میں تیرنا سکھایا گیا تھا دیر تک ایک اچھوت لڑکی کے بھینٹ کئے ہوئے آموں کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ سکھدیو نے اپنی کمزوری پہ ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔

اس کے قہقہے کی آواز تھوڑی دیر کے لیے فضا میں گونج کر تحلیل ہو گئی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے مصنوعی قہقہہ کے جواب میں تمام کائنات ہنس رہی ہے، اسے دریا کی لہریں، چاند اور ستارے سب اپنے خلاف سرگوشیاں کرتے ہوئے نظر آئے اس کا ضمیر بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

"اگر تیرے دھرم میں کمزوری نہیں آئی تو دھرم کے قانون کے خلاف ایک اچھوت لڑکی کے احترام کے کیا معنی! تو ایک طرف دیوتاؤں کو خوش رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی چاہتا ہے کہ ہندو دھرم کے دشمنوں کو بھی تیری طرف

سے کوئی رنج نہ پہنچے۔ تیرا دل گواہی دیتا ہے کہ اچھوتوں کے سردار کی شرافت اور اچھوت لڑکی کی مہمان نوازی برہمو سماج کے مغرور بیٹوں کو شرمسار کر رہی ہے لیکن تو اس کا اعتراف کرنے سے گھبراتا ہے۔ کیا تو اب بھی یہ سمجھتا ہے کہ اگر یہ آم کھانے کی بجائے انہیں دریا میں پھینک دے تو اس جگہ سے واپس جا کر تُو سماج کی زنجیر کا اتنا ہی مضبوط حصہ رہے گا جتنا کہ پہلے تھا.....!!

نہیں! ہرگز نہیں!! تو سر سے لے کر پاؤں تک تبدیل ہو چکا ہے تو وہ سکھدیو نہیں رہا جو سماج کی زنجیر کی ایک مضبوط کڑی بن سکے۔ اب تم وہ سپاہی نہیں رہے جو راجہ اور پروہت کی معمولی سی خوشی کے لیے سینکڑوں انسانوں کے سر قلم کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اب تم راجہ اور پروہت کے حکم کے باوجود کسی شخص کی گردن پر تلوار اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سوچا کرو گے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ تمہیں ہر شودر میں اس بوڑھے سردار اور اس بھولی بھالی لڑکی کی روح نظر آنے لگے اور تم ان لوگوں کی حمایت میں ہندو دھرم کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔"

بغاوت کا خیال آتے ہی سکھدیو کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بہت بڑا پاپ کر چکا ہے اور کوئی نامعلوم طاقت اسے دیوتاؤں کے قدموں سے دُور لے جا رہی ہے اور اس روندی ہوئی ذلیل قوم کے ہزاروں افراد چاروں طرف سے بھاگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں اور بوڑھا سردار اور نوجوان لڑکی اس کا دامن پکڑ کر کہہ رہے ہیں۔

"بتاؤ! ہم میں کیا برائی ہے؟ ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ تم ہم سے نفرت کیا کرتے ہو۔ ہمارے خون کے پیاسے کیوں ہو؟ سکھدیو نے محسوس کیا کہ وہ ان ستم رسیدہ لوگوں کے درمیان ایک مجرم کی طرح کھڑا ہے اور اس کا دل ندامت کے بوجھ سے پسا جا رہا ہے۔ لیکن اس موقع پر ضمیر کی دوسری آواز جو کسی حد تک

مغلوب ہو چکی تھی آخری بار چلائی۔ "سکھدیو! تم گمراہ ہو رہے ہو، دھرم کی لاج رکھو!"

سکھدیو کپکپا اٹھا اور اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے بلند آواز میں پکارا:-

"نہیں! نہیں!! میرا ان ذلیل لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ انہیں دیوتا ٹھکرا چکے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔"

اس کی مُردہ رگوں میں پھر ایک بار زندگی کا خُون دوڑنے لگا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ مقدس دیوتا جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا، اپنی زبردست روحانی طاقت کی بدولت پانی کی سطح پر چل کر اس کی مدد کے لیے آ رہے ہیں اور وہ دیارِ غیر میں ایک بے خانماں مسافر کی حیثیت سے نہیں بلکہ شودروں کی ناپاک بستی میں ہندو سماج کے لاڈلے بیٹے کی حیثیت میں داخل ہُوا ہے اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنی جھولی سے ایک آم نکالا اور دریا میں پھینک دیا۔ آم گرنے کی آواز دریا کی لہروں کے ہنگامے میں گم ہو گئی اور سکھدیو کو پھر ایک بار دریا، پہاڑ، چاند، ستارے اپنے خلاف سرگوشیاں کرتے اور قہقہے لگاتے نظر آنے لگے۔ اس کی رگوں میں خون کی رفتار سست پڑنے لگی۔ اچھوتوں کے لباس میں ستم رسیدہ انسانیت کی پکار پھر ایک بار اس کے ضمیر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ سکھدیو نے محسوس کیا کہ ہندو سماج کے مقدس دیوتا جو پانی کی سطح پر چل کر اس کی مدد کو آئے تھے۔ پھر اپنے اپنے مندروں میں جا کر سو گئے تھے۔ اور وہ پھر ایک بار اکیلا چٹان پہ کھڑا زمین و آسمان کی لامحدود وسعتوں میں فطرت کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کر رہا ہے۔ اس نے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور تصور میں دیکھا کہ بدنصیب قوم کے ہزاروں افراد اپنے سردار سمیت اس کے سامنے کھڑے ہیں اسے کنول پھر ایک بار یہ کہتے ہوئے سنائی دی۔

"پتاجی کو ڈر تھا کہ آپ خفا ہو جائیں گے اس لیے آپ کو کھانے کی دعوت

نہ دے سکے۔ انہوں نے خود بھی کچھ نہیں کھایا۔ میں روٹی نہیں لائی یہ آم ہیں.... کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا حرج ہے؟"

سکھدیو نڈھال سا ہو کر چٹان پر بیٹھ گیا۔ اس نے اچانک یہ محسوس کیا کہ وہ آم جیسے وہ دریا میں پھینک چکا تھا۔ دوسرے کنارے پر جہاں سے دیوتاؤں کی مقدس زمین شروع ہوتی ہے، جا لگا ہے اور اس جگہ کی خاک میں نمو بخشنے والی قوتوں نے اسے ایک تناور درخت بنا دیا ہے ـــــ اور مقدس دیوتا اس کا میٹھا پھل کھا رہے ہیں۔ سکھدیو کے دل سے توہمات کا نقاب یکسر اٹھ گیا۔ اس نے اپنی جھولی سے دوسرا آم نکالا۔ اور دریا کی لہروں یا دیوتاؤں کی زمین کی بجائے اپنے بھوکے پیٹ کو اس کا زیادہ حقدار سمجھتے ہوئے کھانے لگا۔ بھوکے پیٹ نے اچھوت لڑکی کے اپوتر آم کی مٹھاس اور ذائقے کی جی بھر کر داد دی۔ آم ختم کر کے سکھدیو گٹھلی دریا میں پھینکنے لگا تھا کہ اچانک کسی خیال نے اس کا ہاتھ روک لیا اس نے گٹھلی اپنے قریب رکھ لی۔ تمام آم کھا چکنے کے بعد اس نے گٹھلیاں اور چھلکے وہاں سے اٹھائے اور واپس پہنچ کر اپنی چارپائی کے قریب ڈھیر کر دیئے۔

سماج کا باغی

سورج مشرق کے اونچے اونچے پہاڑوں کے عقب سے نمودار ہوا۔ سکھدیو نے انگڑائی لے کر آنکھیں کھولیں۔ سب سے پہلے اس کی نظر بوڑھے سردار پر پڑی جو اس سے دو تین قدم کے فاصلے پر ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا چند آدمی نیچے گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گزشتہ تمام واقعات بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سکھدیو کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سردار اٹھ کر آگے بڑھا اور اس نے سکھدیو کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ سکھدیو نے اس کے ہاتھ پکڑ کے پیچھے ہٹا دیا اور چارپائی سے اتر کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس ماحول کی تلخی کو ایک اداس مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ مجھے زیادہ نادم نہ کریں۔

سردار نے جواب دیا "آپ کی عزت اور سیوا میرا فرض ہے۔"

"نہیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں . . . ایک ایسا مجرم جو کسی حالت میں بھی آپ کے نیک سلوک کا حق دار نہیں۔"

"یہ نہ کہیئے! آپ ہمارے دیوتا ہیں۔"

"کاش! میں دیوتا ہونے کی بجائے آپ جیسا انسان ہوتا۔"

سردار نے پریشان ہو کر سوال کیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں درست کہہ رہا ہوں۔ میں دیوتا نہیں راجہ کی فوج کا ایک سپاہی ہوں

میں جس ارادے سے اس جگہ پہنچا تھا اگر وہ آپ کو معلوم ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس قدر فیاضی سے کام نہ لیں۔ سنیئے! اگر دریا کا طوفان مجھے بے بس بنا کر اس جگہ نہ لے آتا تو آج اس زمین پر آزادی کا سانس لینے کی بجائے ایسے لوگوں کی قید میں ہوتے جن کے دل میں آپ کے لیے رحم کی کوئی گنجائش نہیں۔ آپ کے جھونپڑے جلا دیئے جاتے اور آپ کی چراگاہوں پر ہمارا قبضہ ہوتا۔ کیا اب بھی مجھے آپ ایک دیوتا سمجھتے ہیں؟"

سردار نے جواب دیا "اگر آپ کو ان جھونپڑوں اور چراگاہوں کی ہم سے زیادہ ضرورت ہو تو ہم خوشی سے انہیں چھوڑ کر کسی اور جگہ جانے کو تیار ہیں۔ اس وسیع زمین پر ایسی ہزاروں چراگاہیں تلاش کی جا سکتی ہیں اور لاکھوں جھونپڑے بنائے جا سکتے ہیں۔ جنگ کیے بغیر ہار مان لینے والوں سے جنگ کرنا عقلمندی نہیں"

سکھدیو نے جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر کہا:

"بھگوان کے لیے مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں! میں آج سے پہلے شاید ایک انسان کہلانے کا حق دار بھی نہ تھا۔ آپ نے مجھے وہ سبق دیا ہے جس کی ضرورت شاید ہمارا سماج کئی صدیوں تک بھی محسوس نہیں کرے گا۔ آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔ میں آپ کا داس ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سکھدیو نے جھک کر بوڑھے سردار کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن اس نے سکھدیو کو گلے لگا لیا۔ اچھوت کا چھوت سے [illegible] گیر ہونا تھا کہ دونوں کے دلوں سے بیک وقت یہ آواز اٹھی کہ ہم اس دنیا میں ایک دوسرے سے اس قدر بیگانے اور اجنبی رہنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ہماری جدائی غیر فطری بات تھی۔ سکھدیو کو خود غرض انسانوں کا سماج ایک تصنع، ایک دھوکا اور ایک فریب نظر آنے لگا۔ وہ ایک باغی تھا۔ اس راجہ اور اس پروہت کا باغی جس کی خاطر اس نے ایک دن پہلے موت کے منہ میں کودنے سے

دریغ نہ کیا تھا۔ اچھوتوں کے سردار کا ناپاک جسم جس پر اسے اپنی تلوار کی تیزی کو آزمانا تھا اسے اب انسانی برادری کا قابلِ نفرت نہیں بلکہ قابلِ رحم حصہ نظر آتا تھا۔

سردار نے کہا "یہاں دھوپ آگئی ہے۔ چلیئے ان درختوں کے نیچے بیٹھیں"

سکھدیو، سردار کے ساتھ ہو لیا۔ سردار کے اشارے سے وہ آدمی چارپائیاں اٹھا کر سردار کے مکان کے قریب ایک آم کے درخت کے نیچے لے گئے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ سکھدیو نے ایک پتھر پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور پھر سردار کے ساتھ ہو لیا۔ درخت کے نیچے پہنچ کر سردار اور سکھدیو ایک دوسرے کے قریب چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کنول مٹی کا برتن اور ایک پیالہ اٹھائے آئی اور سردار کے سامنے رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کنول یہ کیا ہے؟" سردار نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"پتاجی! دودھ لائی ہوں۔ آج آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔" یہ کہہ کر کنول نے معنی خیز نگاہوں سے سکھدیو کی طرف دیکھا۔

سردار نے بھی سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا:

"کنول رات بھی ضد کر رہی تھی کہ میں آپ کو کھانے کی دعوت دوں لیکن اس خیال سے کہ آپ ہمیں اچھوت سمجھتے ہوں گے میں نے جرأت نہ کی اب یہ مجھ سے پوچھے بغیر دودھ لے آئی ہے اگر آپ اسے پینا اپنے دھرم کے خلاف سمجھیں تو میں ایک گائے یہاں منگوا دیتا ہوں۔ آپ پتوں کا دونا بنا کر اپنے ہاتھوں سے گائے کا دودھ دوہ لیں۔"

سکھدیو نے کہا: "آپ کے آم کھانے کے بعد میرا دھرم مجھے یہ دودھ پینے سے منع نہیں کرتا۔ آپ کے آم بہت میٹھے تھے۔ مجھے یقین ہے یہ دودھ بھی کڑوا نہیں ہو گا۔"

"کون سے آم؟" سردار نے تعجب سے سوال کیا۔

"وہی جو آپ نے رات کے وقت بھیجے تھے۔ میں سچ کہتا ہوں میں نے ایسے آم کبھی نہیں کھائے۔"

سردار کو اور زیادہ پریشان دیکھ کر کنول بولی "پتاجی! آپ سو گئے تھے میں انہیں آم دے آئی تھی میرا خیال تھا کہ یہ کھا لیں گے۔"

سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا "اچھا یہ دودھ بھی حاضر ہے۔"

سردار کے اشارے سے کنول نے دودھ کا کٹورا بھر کر سکھدیو کو پیش کیا سکھدیو کو پیاس بھی تھی اور بھوک بھی۔ آموں کی طرح اسے دودھ بھی پہلے سے زیادہ میٹھا اور لذیذ معلوم ہوا اس نے دو کٹورے اپنی مرضی سے پیئے اور تیسرا سردار کے اصرار پر۔

سکھدیو کے بعد سردار نے دودھ پیا اور کنول برتن لے کر اندر چلی گئی۔

سردار نے کہا "مجھے ڈر تھا کہ آپ ہمارے ہاتھ کی کوئی چیز نہیں کھائیں گے اس لیے میرا ارادہ تھا کہ آپ کو کل دریا کے پار پہنچا دوں۔ لیکن اب آپ کو چند دن اور یہاں رہنے پر مجبور کروں گا۔ آپ کو ہمارے پاس کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

سکھدیو نے جواب دیا: "آپ کی دعوت کا شکریہ۔ لیکن اگر آپ مجھے یہاں رہنے کی دعوت نہ بھی دیتے تو بھی میں اتنی جلدی واپس جانے کا ارادہ نہ کرتا۔ ہمارا قانون کسی دوسری قوم کے انسان کو اپنی چار دیواری کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی خود غرض سماج سے کنارہ کش ہو کر آپ کے پاس چلا آئے تو آپ شاید اسے واپس بھیج دینا گوارا نہیں کریں گے۔"

"ہم ایسے شخص کو اپنی آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ اسے اس سرزمین کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اتنا ہی حق ہو گا جتنا کہ ہمیں ہے۔"

سکھدیو نے کہا "میرے لیے سماج کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔"
سردار نے جواب دیا "آپ ہمارے جھونپڑوں کو بہت وسیع پائیں گے۔"

---

(٢)

چند دن اور اس معصوم ماحول میں رہنے کے بعد سکھدیو محسوس کرنے لگا کہ وہ برسوں اس بستی میں رہ چکا ہے۔ زندگی کے گزشتہ پچیس برس جو وہ اونچی ذات والوں میں گزار چکا تھا اسے ایک خواب نظر آنے لگے۔ وہ ان لوگوں کے سینوں میں ایک ایسی مشعل کی روشنی دیکھ چکا تھا جو اس ملک کے آرین فاتحین کی محفل سے صدیوں پیشتر بجھ چکی تھی۔ وہ اونچے ایوانوں کو اس مشعل کی روشنی سے آشنا کرنا چاہتا تھا لیکن ان ایوانوں میں سونے والے مہیب طوفانوں کا خوف ایسے ارادوں پر غالب رہا۔

سکھدیو صبح شام بعض اوقات سردار کے ساتھ اور اکثر تنہا دریا یا پہاڑوں کی طرف سیر کے لیے چلا جاتا اسے قدرت کا ہر منظر خود غرض انسانوں کے سماج پر مسکراتا ہوا نظر آتا۔ وہ واپس جاکر اونچی ذات والوں کو ایک نیا پیغام سنانے کے لیے بے قرار تھا لیکن کوئی زبردست کشش اسے چند دن اور پہاڑوں اور وادیوں میں گھومنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کسی کی معصوم نگاہیں اس کے دل کے خاموش تاروں کو جنبش دے کر ایک ایسا نغمہ پیدا کر رہی تھیں جس کے زیر و بم سے اسے قدرت کے تمام مناظر متاثر دکھائی دیتے تھے کسی کی حیا میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ اسے خوابوں کی حسین دنیا کی طرف بلا رہی تھی کسی کی زبان کا ہر لفظ اس کے لیے ایک راگ بن رہا تھا۔

کنول اسے اس خستہ حال قوم کی بیٹی سے زیادہ اس خطۂ زمین پر قدرت کے حسین مناظر کا ایک جزو معلوم ہوتی تھی لیکن سکھدیو کو اس بات کا اعتراف گوارا نہ تھا۔ کہ کنول کی طرف اس کا میلان اس کی جسمانی خوبیوں کی وجہ سے تھا۔ اسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ ظالم سماج کے خلاف بغاوت کر کے شودروں کی جماعت میں داخل ہو چکا ہے لیکن اپنے دل پر ایک اچھوت لڑکی کی فتح اس کے نزدیک ایک بدترین شکست کے مترادف تھی۔ وہ چاروں طرف سے ہار مان کر اپنے دل کو اتنا فریب ضرور دینا چاہتا تھا کہ کنول کے ساتھ اس کا لگاؤ محض رحم و انصاف کے ان مقدس جذبات کی پیداوار تھا جن کے ماتحت وہ نوع انسان کے ہر گرے ہوئے فرد کو اٹھانے کے لیے تیار تھا لیکن اچھوت قوم کی ایک حسین لڑکی کو ایک شمع تصور کر کے اس پر پروانہ وار فدا ہو جانا اس کے وقار کے منافی تھا۔ وہ کسی کے لیے شفقت کا ہاتھ اٹھانے سے پہلے اسے اپنے لطف و کرم کا متمنی دیکھنے کا آرزومند تھا لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کا یہ وہم دور ہوتا گیا کہ حسن اور معصومیت کی یہ ملکہ اپنے غرور کا تاج اتار کر اس کے پاؤں پر رکھ دے گی۔

سکھدیو کے ساتھ کنول کی ابتدائی دلچسپی ان نسوانی جذبات کی پیداوار تھی۔ جن کی بدولت نوجوان لڑکیاں کسی پردیسی کے دکھ اور تکلیف کو اپنا دکھ اور اپنی تکلیف سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں لیکن جب سردار کی قوم کے سینکڑوں افراد سکھدیو کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگے تو کنول قدرے تکلف سے کام لینے لگی۔ ابتدا میں وہ سکھدیو کی غریب الوطنی سے متاثر ہو کر اسے اپنی طرف سے دلجوئی کا حقدار سمجھتی تھی لیکن سکھدیو کی اجنبیت دور ہوتے ہی اس کا مردانہ وقار اسے مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے مغلوب کرنے لگا۔

سردار کی بیٹی اپنے باپ کی طرح بھٹکے ہوؤں کی قیادت اور گرے ہوؤں کی

اعانت اپنا فرض سمجھتی تھی لیکن اپنے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے جسم کے لیے اسے کسی کے طاقتور ہاتھوں کا سہارا گوارا نہ تھا۔ سکھدیو کی مصیبت زدہ صورت پر ترس کھانے والی آنکھیں اپنے دل میں کروٹیں لینے والے طوفان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

---

(۲)

ایک شام سکھدیو حسب معمول سیر کے لیے نکلا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ساون کی بھیگی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بارش کی آمد کا پیغام دے رہے تھے۔ سکھدیو دریا کے کنارے ایک اونچی چٹان پر کھڑا ہو کر بہتے ہوئے پانی کا دلکش منظر دیکھنے لگا۔ دریا کی لہریں اس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات دہرانے لگیں اور وہ گرد و پیش سے بے خبر سا ہو کر پھر ایک بار اپنی زندگی کا وہ حسین ترین نغمہ سننے لگا جس کے الفاظ یہ تھے:

"پتا جی کو ڈر تھا کہ آپ خفا ہو جائیں گے...... میں روٹی نہیں لائی..... یہ آم ہیں..... کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا حرج ہے؟"

اس کے بعد اسے کنول کے موجودہ طرز عمل کا خیال آیا اور اس نے محسوس کیا کہ فضا میں اداسی چھا رہی ہے اس نے اپنے دل میں کہا "میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میرا یہاں کون ہے۔ کنول جیسی بھولی بھالی لڑکی میرے دل تک کیونکر پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اس کا کیا قصور؟ میں نے خود اپنے دل کا حال اس سے چھپائے رکھا...... اور اگر میں اس پر اپنے دل کی کیفیت ظاہر بھی کر دوں تو بوڑھا سردار یہ کیسے گوارا کرے گا کہ اس کی لاڈلی بیٹی ایک اجنبی کے ساتھ منسوب ہو جائے

اس کے تمام احسانات کے بعد میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کے سامنے اتنے بڑے انعام کے لیے ہاتھ پھیلاؤں۔ وہ مجھے شرافت کا مجسمہ خیال کرتا ہے اور میری طرف سے ایسی کوئی حرکت یقیناً مجھے اس کی نظروں سے گرا دے گی...

نہیں، نہیں!! مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا لیکن میں اب کہاں جا سکتا ہوں۔ اپنے دیس میں اب کھشتری ہو کر رہنے کی میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔ ان اونچے پہاڑوں میں شاید کہیں مجھے سکون حاصل ہو سکے۔"

اپنے دل میں اس قسم کے ہزاروں منصوبے باندھتا ہوا سکھدیو واپس مڑا اور چٹان سے نیچے اتر کر اس نے ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اسے تھوڑی دور گھاس پر کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ شام کے دھندلکے میں وہ اسے پہچان نہ سکا لیکن قریب پہنچ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کنول منہ دوسری طرف کیے بیٹھی تھی اور زمین سے گھاس کے تنکے اکھاڑ اکھاڑ کر ایک طرف پھینک رہی تھی۔ سکھدیو کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ سکھدیو نے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پا کر پوچھا۔

"کنول! اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

کنول نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہاں میں نے آم کی گٹھلیاں بوئی تھیں۔ برسات کی وجہ سے گھاس بہت زیادہ ہو گئی ہے، میں اسے صاف کر رہی تھی۔"

سکھدیو نے نیچے دیکھا۔ آم کے چھوٹے چھوٹے پودوں کی کونپلیں زمین سے باہر پھوٹ نکلی تھیں۔

سکھدیو نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں آموں کا بہت شوق ہے۔ تم

نے پہلے بھی کبھی آم بوئے ہیں؟"

کنول نے جھجکتے ہوئے جواب دیا "نہیں ...... یہ آم اس دن آپ نے کھائے تھے میں نے گٹھلیاں لا کر اس جگہ بو دیں۔ یہ تمام اُگ آئی ہیں۔"

کنول کے یہ سیدھے سادے الفاظ سکھدیو کی توقع سے بہت زیادہ تھے اس کا دل جو ایک لمحہ پیشتر ایک تلخ احساس کے ماتحت بیٹھا جا رہا تھا خوشی سے اچھل پڑا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ محبت کی پریاں آم کے پودوں کے درمیان رقص کر رہی تھیں۔ سکھدیو پودوں کے قریب بیٹھ گیا اور ان کے گرد اُگی ہوئی گھاس اکھاڑنے لگا۔ ان پودوں کی نرم و نازک کونپلوں میں اسے کنول کے دل کی سادگی اور رنگینی نظر آنے لگی۔ اسے اپنی شکست کا اعتراف کر لینے میں کوئی عذر نہ تھا۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ سکھدیو اور کنول بھاگ کر ایک درخت کے نیچے پہنچے اور ایک دوسرے سے ذرا ہٹ کے کھڑے ہو گئے لیکن جب بارش کا زور بڑھا اور ہوا کے تند جھونکے کے ساتھ آنے والے چھینٹوں کی وجہ سے کوئی جگہ محفوظ نہ رہی تو دونوں درخت کے ایک موٹے تنے کے نیچے سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

نیچ ذات کی کم مائیگی کے احساس سے بیگانہ اور اونچی ذات کے تقدس سے بے نیاز دو دھڑکتے ہوئے دلوں کے درمیان اجنبیت کے تمام پردے اُٹھ چکے تھے۔

سکھدیو نے کہا "کنول! تم نے وہ آم کیوں بوئے تھے؟"

"آم آپ کو پسند نہیں؟"

"کیوں نہیں۔ تمہارے ہاتھ کے آم تو بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ ان آموں کی مٹھاس میں اب تک محسوس کر رہا ہوں۔"

"آپ بھوکے تھے ورنہ ان آموں میں کوئی خاص خوبی نہ تھی۔"

سکھدیو نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا "کنول! میں تمہارے پاس صرف چند دن اور ہوں۔"

"چند دن؟" کنول نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں کنول! مجھے ڈر ہے کہ اگر میں زیادہ دن ادھر ٹھہرا تو آپ لوگ اکتا جائیں گے۔"

"اگر آپ اس خیال سے جانا چاہیں تو پتاجی آپ کو اجازت نہیں دیں گے لیکن اگر آپ ہم سے اکتا کر جانا چاہیں تو آپ کو کون روک سکتا ہے۔ آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔"

"لیکن اس بستی میں ایک وجود ایسا بھی ہے جو مجھے روک سکتا ہے اور جس کا معمولی سا اشارہ میرے ارادوں کو توڑ سکتا ہے۔"

"وہ کون؟"

"تم نہیں جانتیں اسے؟"

"نہیں! اگر مجھے اس کا پتہ چل جائے تو میں خود اس کی منت کروں۔ کہ وہ ہمیشہ آپ کے ارادے توڑتا رہے۔"

"کنول تمہیں معلوم نہیں وہ تمہی تو ہو"

"میں"

"ہاں تم!"

کے دل و دماغ میں چھپ کر اپنے کسی اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لیے کام کر رہی تھی اپنے من کے اُجڑتے ہوئے مندر کو بسانے کے لیے وہ سماج کے ان دیوتاؤں کی بجائے جو اسے اپنے اور کنول کے درمیان چھوت چھات اور نفرت و حقارت کی ایک دیوار کھینچنے کے مجرم نظر آتے تھے۔ کسی ایسے بھگوان کی زبردست طاقت کے تصور کو جگہ دے رہا تھا جس نے اسے دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ جس نے مصیبت کے وقت اس کے بدترین دشمن کو اس کا بہترین دوست بنا دیا تھا۔ جس نے ایک بھولی بھالی لڑکی کو مہمان نوازی کے عجیب و غریب انداز سکھا دیے تھے اور جس نے اسے اپنی زبردست طاقت سے مرعوب کر کے کنول کے ہاتھ سے آم کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سکھدیو یہ سمجھتا تھا کہ کنول اس دن جب کہ وہ بے حد مایوس تھا صرف اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے دیکھنے کے لیے ہی نہیں آئی تھی بلکہ قدرت نے اس بہانے انہیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے اور سننے کا موقع دیا تھا اسے یقین تھا کہ ان کی روحیں ایک ساتھ رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہیں اور وہ طاقت جو اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ سب کچھ کر چکی ہے عنقریب کوئی ایسا قدم اٹھائے گی جس سے کنول اور اس کے درمیان رہی سہی رسمی اور ظاہری دیواریں بھی ٹوٹ جائیں گی۔

اس قیدی کی طرح جو منصف کی نیک نیتی پر یقین اور اپنی معصومیت کے احساس کی بدولت عدالت میں پابہ زنجیر کھڑا ہونے کے باوجود یہ سمجھ کر مسکرا رہا ہو کہ عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ سکھدیو نے اطمینان کے ساتھ ان لوگوں میں دو مہینے گزار دیے۔

اس دوران میں اس نے سردار سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے لیے ایک علیحدہ جھونپڑی تعمیر کرنے کی اجازت دے لیکن سردار نے جواب دیا "آپ جیسے مہمان تو

"تو میں ایک بار نہیں ہزار بار کہتی ہوں کہ آپ جائیں۔"

سکھدیو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں نہیں جاؤں گا کنول۔ میں نہیں جاؤں گا! میں جا بھی کہاں سکتا ہوں؟"

دونوں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ تاریکی بڑھ رہی تھی ہوا رک چکی تھی لیکن بارش کا زور پہلے سے بھی زیادہ تھا۔

کنول نے کہا "بارش شاید کم نہ ہو ہمیں چلنا چاہیے۔ پتاجی پریشان ہوں گے۔"

"چلو!"

دونوں ایک ساتھ ہی چند قدم آگے بڑھے تھے کہ بادل گرجا اور کنول نے سہم کر سکھدیو کا بازو تھام لیا۔

"ڈر گئیں؟"

"نہیں" کنول نے سکھدیو کا بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔

چند بار بجلی چمکی لیکن سکھدیو اور کنول بجلی کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنے کی بجائے بار بار ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کی کوشش کرتے مکان سے تھوڑی دور کنول رک گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا:

"آپ یہیں ٹھہریں۔ میں پہلے اندر چلی جاؤں۔ آپ تھوڑی دیر بعد آئیں۔"

---

(۴)

سکھدیو گذشتہ واقعات کو ایک معمہ سمجھتا تھا لیکن کنول سے تنہائی میں اس غیر متوقع ملاقات کے بعد اسے یہ تمام واقعات ایک دوسرے سے اس قدر مربوط نظر آنے لگے کہ وہ کسی ایسی نامعلوم طاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور

کے لیے میرا گھر بہت وسیع ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے پچھلی عمر میں ایک جوان بیٹا مل گیا ہے۔ سکھدیو نے سردار کے اس انکار کو بھی اس طاقت کی منشا کے مطابق سمجھا اور سردار کے مکان میں ایک کمرے کو گوشۂ جنت سمجھنے لگا۔

اس بستی میں صرف سردار کا مکان ایسا تھا جس کی دیواریں پتھر اور چھت لکڑی کی تھی۔ باقی تمام لوگ سرکنڈے کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔

رات کے وقت عام طور پر سکھدیو کی چارپائی صحن سے باہر کھلی ہوا میں بچھا دی جاتی۔ لیکن بارش کے وقت وہ اپنے کمرے میں سوتا۔ اس کمرے کی آرائش کے لیے چیتے اور ریچھ کی کھالیں بچھا دی گئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک تلوار بھی لٹکی ہوئی تھی جو سکھدیو نے اپنے خیال کے مطابق ہمیشہ کے لیے اتار کر پھینک دی تھی۔ لیکن کنول نے ایک قابلِ قدر چیز سمجھ کر اس جگہ رکھ دی تھی۔

سزا

بھادوں گزرتے ہی موسم میں تبدیلی ہونے لگی اور یہ لوگ کھلی ہوا میں سونے کی بجائے اندر سونے لگے۔ سکھدیو جس کمرے میں سوتا تھا اس کے برابر والا کمرہ سردار کا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد کبھی سردار سکھدیو کو اپنے کمرے میں بلا لیتا اور کبھی وہ اور کنول سکھدیو کے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ سردار اپنے عہدِ جوانی کے سیر و شکار کی دلچسپ داستانیں سناتا اور سکھدیو یا تو راجوں مہاراجوں کی لڑائیوں کے واقعات بیان کرتا اور یا نیچ ذات لوگوں سے سماج کے مظالم کا گِلہ کرتا۔

جب یہ دلچسپ محفلیں برخاست ہوتیں اور سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تو سکھدیو بستر پر لیٹ کر برابر کی کوٹھڑی میں کروٹیں لینے والی محبوبہ سے تصور میں باتیں کرتا ہُوا سو جاتا۔ علیٰ الصّباح وہ بیدار ہوتے ہی گاؤں سے کچھ دُور ایک جھیل کی طرف چلا جاتا۔ اور جھیل کے ٹھنڈے اور شفاف پانی میں نہانے کے بعد کنول کے بڑے بڑے پھُول توڑ لاتا۔

ایک صبح کنول حسبِ معمول دودھ کا کٹورا لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سکھدیو اس کی آمد سے بے خبر کنول کے ایک پھول کو اپنے ہونٹوں سے لگائے اس کی مہک اور ٹھنڈک کا اثر محسوس کر رہا تھا۔

کنول تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد پیالہ آگے بڑھاتے ہوئے بولی:۔

"لیجئے!" سکھدیو نے چونک کر پھول نیچے پھینک دیا اور کنول کے ہاتھوں سے دودھ کا پیالہ لے کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کنول نے اپنے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یہ پھول بہت پسند ہیں؟"

"ہاں! لیکن اگر ان کا نام کنول نہ ہوتا تو شاید مجھے اس قدر پسند نہ ہوتے۔"

کنول نے حیا اور احسان مندی سے آنکھیں جھکا لیں۔ سکھدیو نے کنول کے چہرے میں ایسی جاذبیت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

اس نے کہا۔ "کنول! میں سچ کہتا ہوں تم ان پھولوں سے کہیں زیادہ ...!"

سکھدیو ابھی اپنا فقرہ پورا نہ کرنے پایا تھا کہ کنول نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر برابر والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ ابھی تک یہیں ہیں؟"

کنول نے جواب دیا۔ "ہاں!"

"اچھا تو میں آہستہ سے کہتا ہوں کہ تم ان پھولوں سے زیادہ حسین ہو۔"

کنول لجا کر بولی۔ "آپ دودھ پی لیں۔"

"بہت اچھا۔" سکھدیو نے دودھ کا پیالہ اٹھا کر منہ سے لگایا ہی تھا کہ مکان سے باہر لوگوں کی چیخ پکار سنائی دی۔

کنول وحشت زدہ ہو کر بولی۔ "شاید باہر لڑائی ہو رہی ہے۔"

سکھدیو نے متعجب ہو کر کہا۔ "لڑائی ——! نہیں یہ لڑائی نہیں۔ مجھے چاروں طرف سے چیخ پکار کی آواز آ رہی ہے۔ شاید وہ آ پہنچے۔"

"کون؟"

"سماج کے بہادر، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سکھدیو نے تلوار اٹھائی

لیکن ابھی کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ چند آدمی بھاگتے اور چیخیں مارتے ہوئے صحن میں آ داخل ہوئے تمام ایک آواز میں یہ کہہ رہے تھے۔ "وہ آگئے! وہ آگئے! انہیں مار ڈالا۔ سردار کہاں ہے؟"

سکھدیو نے چند بار ان سے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ کیا ہوا۔ کون آگئے لیکن اسے ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ آگئے۔ انہوں نے بستی پر حملہ کر دیا ہے۔

سکھدیو نے بھاگ کر باہر نکلنا چاہا لیکن ایک نوجوان نے اس کا بازو تھام لیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے کہا "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔"

نوجوان نے کہا "نہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ آپ موت کے منہ میں نہ جائیے وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔"

اتنے میں سردار آنکھیں ملتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا؟"

ایک شخص بولا۔ "انہوں نے رات کے وقت دریا عبور کر لیا۔ وہ اچانک حملہ کر کے آس پاس کی تمام بستیاں ویران کر چکے ہیں۔ ان کے بہت سے سپاہی ہماری بستی میں بھی گھس آئے ہیں اور جو سامنے آتا ہے اسے بے دریغ قتل کر دیتے ہیں۔ بہت سی جھونپڑیوں میں انہوں نے آگ لگا دی ہے اب مقابلے کا وقت نہیں ہمیں ادھر ادھر بھاگ کر اپنی جان بچانے کی فکر کرنی چاہیئے۔"

سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھا اس نے کہا۔ "آپ سب یہیں ٹھہریں میں جاتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں انہیں روک سکوں گا۔"

اتنے میں چند اور آدمی بھاگتے ہوئے صحن میں داخل ہوتے اور انہوں نے بتایا کہ راجہ کے سپاہی اسی طرف آ رہے ہیں۔"

سردار کے اشارے سے نوجوان نے سکھدیو کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور وہ بھاگ نکلا۔

---

(۲)

دُور دُور کی جھونپڑیوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور لوگ وحشت زدہ ہو کر ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اکثر کا رُخ پہاڑوں کی طرف تھا اور بعض ابھی تک اپنے بوڑھے سردار کو اپنی سب سے بڑی پناہ خیال کر کے اس کے گھر کا رُخ کر رہے تھے۔ پیدل سپاہیوں کی ایک ٹولی ایک سوار کی قیادت میں مار دھاڑ کرتی ہوئی سردار کے مکان کی طرف آ رہی تھی۔ سکھدیو بھاگ کر ان کے قریب پہنچا۔ سپاہیوں نے اپنے پرانے سپہ سالار کی طرف دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس ٹولی کا نوجوان سالار بھی سکھدیو کو دیکھتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور سیناپتی! سیناپتی!! کہتا ہوا سکھدیو کے پاؤں پر گر پڑا۔ سکھدیو نے اسے اٹھا کر گلے لگا لیا۔ یہ رام داس تھا۔

"بھگوان کا شکر ہے کہ آپ سلامت ہیں کہیئے آپ کے ساتھ کیا بیتی؟"

سکھدیو نے کہا "یہ باتوں کا وقت نہیں۔ تم فوراً گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور فوج کو قتل و غارت بند کرنے کا حکم دو۔"

"لیکن ..... !"

"لیکن کیا؟ ..... میں تمہیں حکم دیتا ہوں!"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن سیناپتی گنگارام ہے اور اس کا حکم ہے کہ کسی کو زندہ بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے۔"

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں!!" سکھدیو نے اپنی آواز کو زیادہ مؤثر بناتے

ہوئے کہا۔

سابق سپہ سالار کی غضب ناک نگاہوں نے رام داس کے دل میں اطاعت کا پرانا جذبہ بیدار کر دیا وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہُوا اور آن کی آن میں جھونپڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

سکھدیو نے باقی سپاہیوں کو بھی حکم دیا کہ وہ اِدھر اُدھر بھاگ کر تمام لشکر کو قتل و غارت بند کر دینے کا حکم پہنچا دیں۔ سپاہی بغیر کسی حیل و حجت کے وہاں سے بھاگے اور چاروں طرف چھائے ہوئے لشکر کے افسروں اور سپاہیوں کو سکھدیو کا پیغام پہنچانے لگے۔

اس بستی کے دوسرے کونے میں گنگارام ایک بلند ٹیلے پر اپنے سفید گھوڑے کی لگام تھامے اپنی سپاہیانہ زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ دیکھ رہا تھا۔ آٹھ دس سوار اپنے سپہ سالار کی حفاظت کے لیے کھڑے نہتوں کو سماج کے بہادروں کی خون آشام تلواروں کے سامنے بدحواس ہو کر بھاگتے اور زخمی ہو کر گرتے اور تڑپتے دیکھ کر اپنے جنگی دیوتاؤں کی شان دار فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ اچانک رام داس سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہُوا نمودار ہُوا۔ گنگارام کو اس کا میدان سے اس طرح واپس لوٹنا اچھا شگون نظر آیا۔ رام داس نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا اور کہا:

"مہاراج! سیناپتی مل گئے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ ہم ان لوگوں کا تعاقب نہ کریں اور قتل و غارت سے اپنے ہاتھ روک لیں۔"

"کونسا سیناپتی یہ حکم دیتا ہے؟ سیناپتی میں ہوں رام داس! تمہارے حواس تو درست ہیں؟"

"میرے حواس درست ہیں مہاراج! میں نے ابھی ابھی سیناپتی سکھدیو کو

دیکھا ہے۔ انہوں نے بڑی سختی سے مجھے حکم دیا ہے کہ ہم ان نہتے لوگوں پر زیادتی نہ کریں۔

"سکھدیو آؤ وہ یہاں ہے۔ وہ زندہ ہے اور وہ یہ حکم دیتا ہے کہ تم میرا حکم نہ مانو یعنی میرے اور راجہ کے خلاف بغاوت کر دو۔"

"مہاراج! انہوں نے یہ نہیں کہا۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ بے گناہ لوگ ہیں۔ انہیں قتل نہیں کرنا چاہیے۔"

"سکھدیو کہتا ہے کہ یہ لوگ بے گناہ ہیں؟ یہ لوگ جنہوں نے صدیوں سے ہماری حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے ـــ کہاں ہے وہ؟"

رام داس نے بستی کی دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس طرف آئیے میرے ساتھ۔"

گنگا رام اور اس کے ساتھی گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے رام داس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ گنگا رام کے پہنچنے سے پہلے ہی لشکر کے بہت سے سپاہی سکھدیو کے اس جگہ موجود ہونے کی خبر پا کر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

اچھوتوں کا سردار سادن اور اس کے بعض ساتھی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ بلا ٹل چکی ہے آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور سکھدیو کے قریب پہنچ کر سپاہیوں کے گروہ سے علیحدہ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سکھدیو نے صرف ایک نظر بوڑھے سردار کے مغموم چہرے اور کنول کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا اور ندامت سے سر جھکا لیا۔

ایک نوجوان ایک زخمی بچے کو اٹھائے آگے بڑھا اور اسے سکھدیو کے پاؤں میں لٹا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سکھدیو نے دیکھا کہ اس ننھے معصوم کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے اور وہ سہمی ہوئی آنکھوں کے سوا جسم

کے باقی اعضا سے زندگی کے آثار ختم ہو چکے ہیں۔ سکھدیو جانتا تھا کہ اس بچے کی ماں کے علاوہ کئی اور عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں اور ان کی نگاہوں کے سامنے سر اٹھانے کی بجائے اسے اپنی توجہ اس بچے پر مرکوز رکھنا زیادہ آسان نظر آیا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تلوار زمین پر رکھ دی اور بچے کے سر کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بچے نے ایک گہری سانس لی اور اس کے ساتھ ہی خون کی ایک ہلکی سی دھار منہ سے بہہ نکلی اس کی چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھوں میں زندگی کی روشنی کی آخری جھلک آہستہ آہستہ ماند پڑ گئی۔ سکھدیو نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر دیں اور اس کا سر پھر زمین پر رکھ دیا۔ ایک عورت جگر دوز چیخوں کے ساتھ آگے بڑھی اور اس نے معصوم بچے کی لاش اٹھا کر اپنے سینے کے ساتھ لگا لی۔

سکھدیو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سپاہیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سپاہی جو کئی میدانوں میں سکھدیو کے گھوڑے کو دشمن کی لاشوں پر سے گزرتا ہوا دیکھ چکے تھے ایک اچھوت بچے کی موت پر اسے اس قدر مغموم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بعض اس کی دماغی حالت صحیح ہونے پر بھی شک کر رہے تھے۔

اتنے میں رام داس کے ساتھ گنگا رام اور اس کے ساتھی آ پہنچے۔ گنگا رام قریب پہنچ کر چلایا:

"تم یہاں کھڑے ہو؟ اور یہ بدمعاش اچھوت تمہارے پاس کھڑے ہیں۔ کیا ہو گیا تمہیں ہلتے کیوں نہیں؟" یہ کہتا ہوا وہ چند قدم اور آگے بڑھا اور سکھدیو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس کی یہ باتیں سنتے ہی سردار اور اس کے چند ساتھیوں کے سوا باقی تمام لوگ تتر بتر ہو گئے لیکن سکھدیو کی موجودگی میں کسی نے ان کا تعاقب نہ کیا۔

گنگارام نے غصے سے بے قابو ہو کر سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا۔

"سکھدیو! اب مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم ابھی تک زندہ ہو اور ایک سپاہی کی حیثیت میں اس فوج کے پرانے سیناپتی کی تعظیم بھی مجھ پر فرض ہے لیکن اس وقت اس فوج کا سیناپتی میں ہوں۔ تم اس وقت میرے سپاہیوں کو بہکا کر راجہ اور سماج کے خلاف کھلی بغاوت کا ثبوت دے رہے ہو۔ تم خود اپنا فرض پورا نہ کر سکے اور اب ذاتی دشمنی کی بنا پر یہ نہیں چاہتے کہ اس کامیابی کا سہرا میرے سر ہو۔"

سکھدیو نے سپاہیوں کی توقع کے خلاف کچھ کہے بغیر بدنصیب عورت کی گود سے بچے کی لاش چھین لی اور گنگارام کو پیش کرتے ہوئے کہا:

"یہ لو اپنی کامیابی کا تحفہ! اپنی فتح کا سب سے بڑا انعام اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کے خون سے اپنے راجہ اور اپنے سماج کے شاندار کارناموں کی تاریخ لکھو تاکہ تمہاری آنے والی نسلیں یہ نہ کہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نیزوں اور تلواروں کے استعمال سے واقف نہ تھے۔"

گنگارام چلایا "میرا راجہ! میرا سماج! گویا تمہارا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور تم گوشت کے اس ناپاک لوتھڑے کو اٹھا کر ہمارے سامنے اپنا دھرم بھرشٹ کر رہے ہو!"

"یہ معصوم جسم تم سے زیادہ پوتر ہے۔"

گنگارام نے دانت پیستے ہوئے کہا "سکھدیو! تم چنڈال ہو۔ اس کتیا نے تم پر جادو کر دیا ہے۔"

سکھدیو اپنے سے زیادہ ایک زخم خوردہ ماں کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ گنگارام کے ان الفاظ نے اس کی مردہ رگوں میں ایک نئی زندگی اور اس کے منجمد خون میں ایک غیر معمولی حرارت پیدا کر دی۔ اس نے فوراً مڑ کر بچے کی لاش اس کی

ماں کے حوالے کی اور جلدی سے تلوار اٹھا کر گنگارام کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کہا "گنگارام! تم بزدل بھی ہو اور کمینے بھی! نیچے اترو گے یا میں بھی گھوڑے پر سوار ہو جاؤں؟"

گنگارام یہ سنتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور تلوار سونت کر سکھدیو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چند افسروں نے مداخلت کی کوشش کی لیکن گنگارام نے کہا "یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے" سپاہی ادھر ادھر ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

سکھدیو کی زنگ آلود تلوار گنگارام کی چمکتی ہوئی تلوار سے ٹکرانے لگی۔ سپاہیوں کی اکثریت گنگارام سے متنفر تھی لیکن اچھوت بچے کی لہو تر لاش کو ہاتھ لگانے کے بعد انہیں سکھدیو بھی نیک سلوک کا مستحق نظر نہیں آتا تھا بلکہ وہ یہاں تک محسوس کر رہے تھے کہ سکھدیو نے سماج کی جو توہین کی ہے اس کی سزا اسے مل کر رہے گی اور سماج کے دیوتا اسے زک پہنچانے کے لیے گنگارام کی مدد کریں گے۔

کنول اپنے باپ کے قریب کھڑی تھی اور وہ آنکھیں بند کیے انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ آسمان اور زمین کی تمام طاقتوں کو سکھدیو کی مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

گنگارام کے چند وار روک لینے اور ان کا جواب دینے کے بعد سکھدیو نے ایک پرزور حملہ کر کے گنگارام کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا۔ پیچھے ہٹتے وقت گنگارام کا پاؤں گھاس پر سے پھسلا اور وہ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود پیٹھ کے بل گر پڑا۔ پیشتر اس کے کہ وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا، سکھدیو کی تلوار کی نوک اس کے سینے پر تھی۔ گنگارام انتہائی بے بسی کی حالت میں اپنے حریف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سکھدیو نے تلوار پیچھے ہٹا لی اور کہا:

"اٹھیے سیناپتی جی! میری تلوار گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے کی عادی نہیں ہے"

گنگارام پر ان الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا۔ اس نے اٹھ کر سنبھلتے ہی زندگی اور موت سے بے پرواہ ہو کر سکھدیو پر پے در پے وار شروع کر دیئے۔ سکھدیو نے چند وار اپنی تلوار پر روکنے کے بعد پھر ایک زوردار حملہ کیا لیکن اس دفعہ اس کی تلوار پوری طاقت کے ساتھ گنگارام کی ڈھال کے ساتھ ٹکرائی اور اس کا تقریباً نصف حصہ ٹوٹ کر نیچے آ گرا۔ گنگارام نے بہادروں کی رسومات جنگ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور سکھدیو پر پہلے کی نسبت زیادہ تندی اور تیزی سے وار کرنے لگا۔ تلوار کے بچے کھچے حصے کے ساتھ سکھدیو اب صرف گنگارام کے وار روکنے اور ادھر ادھر ہٹ کر اپنا بچاؤ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس حالت میں سکھدیو کے بازو پر چند معمولی سے زخم آ گئے۔ رام داس نے جب اس کے بازو سے خون بہتا دیکھا تو سکھدیو کے ساتھ پرانی محبت نے جوش مارا اور اس نے تلوار کھینچ لی لیکن اس کے میدان میں آنے سے پہلے ساون بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے "ٹھہرو! ٹھہرو!" کہتا ہوا سکھدیو اور گنگارام کے درمیان حائل ہو گیا۔ چشم زدن میں گنگارام کی تلوار سردار کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی سینے تک نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ زخم کی شدت نے اسے زیادہ دیر تڑپنے بھی نہ دیا۔ سکھدیو نے ٹوٹی ہوئی تلوار زمین پر پھینک دی اور جھک کر بوڑھے سردار کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس پر اپنی پیشانی رکھتے ہوئے کہا:

"میرے محسن! میرے پتا! تم ہمارے درمیان کیوں کود پڑے؟"

سکھدیو کے ان الفاظ نے سپاہیوں کو اور بھی بددل کر دیا اور وہ حیرت

واستعجاب کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ گنگارام جو بدستور اپنے ہاتھ میں تلوار لیے کھڑا تھا بولا:

"اس پر دیوتاؤں کی لعنت ہو۔ یہ ایک اچھوت کو پتا جی کہتا ہے۔ سپاہیو! یہ سماج کا باغی ہے اسے گرفتار کر لو!"

سپاہی گنگارام کا یہ حکم سن کر پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ گنگارام نے پھر گرج کر کہا "تم کیا دیکھ رہے ہو گرفتار کیوں نہیں کرتے اسے؟"

یہ کہتے ہوئے گنگارام نے اپنے چند خاص آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھ کر سکھدیو کے ہاتھ ایک مضبوط رسی سے باندھنے لگے۔ سکھدیو نے ان کی توقع کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کی۔ گنگارام کے تیور دیکھ کر رام داس بھی اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔

کنول، جس پر اس کے باپ کی موت نے تھوڑی دیر کے لیے سکتہ طاری کر دیا تھا اچانک آگے بڑھی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سکھدیو کی ٹوٹی ہوئی تلوار زمین پر سے اٹھائی اور گنگارام پر حملہ کر دیا! ایک سپاہی نے عین موقع پر خبردار ہو کر اپنی تلوار آگے بڑھا دی اور کنول کا وار روکنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور گنگارام کے بازو پر زخم آ گیا۔ دوسرے سپاہی نے جھپٹ کر کنول کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔

سکھدیو کی تمام توجہ سردار کی لاش کی طرف تھی۔ جب اس نے اچانک نگاہ اوپر اٹھائی۔ کنول دو سپاہیوں کی گرفت میں جدوجہد کر رہی تھی۔ سکھدیو کے منہ سے بے اختیار "کنول" کا لفظ نکل گیا اس کے ساتھ ہی اس نے گنگارام کی طرف دیکھا اور کہا: "اس دیوی کو چھوڑ دو اور مجھے جہاں تمہارا جی چاہے لے چلو۔"

گنگارام نے جواب دیا

اور یہ میری مجرم ہے اس کا فیصلہ میری مرضی سے ہوگا۔"

"تمہاری مجرم؟"

گنگارام نے اپنے بازو کا زخم دکھاتے ہوئے کہا "ہاں یہ دیکھو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میرے مجرم کے ساتھ تمہیں بھی گہری دلچسپی ہے اور تم اس کا نام بھی جانتے ہو اور شاید اسی کا دل خوش کرنے کے لیے اس ذلیل کتے کو پتا جی کہہ رہے تھے۔"

سکھدیو کی غیرت نے پھر ایک بار جوش مارا اور اس نے سپاہیوں کو ادھر ادھر دھکیل کر اپنے ہاتھوں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی لیکن گنگارام نے تلوار کی نوک کنول کے سینے کی طرف کرتے ہوئے کہا "اگر تم نے معمولی سی حرکت بھی کی تو تمہاری کنول کی خیر نہیں" سکھدیو اس دھمکی کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا۔

---

(۲۱)

اگلے دن تین کشتیاں دریائے بیاس عبور کر رہی تھیں ایک کشتی میں گنگارام، رام داس اور فوج کے چند سپاہی تھے۔ دوسری کشتی میں سکھدیو اور کنول کے علاوہ چند پہرے دار تھے اور تیسری کشتی میں چند گھوڑے تھے۔ سماج کے باغیوں کے سردار کے قتل کے بعد گنگارام کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا۔ کہ وہ دوبارہ منظم صورت میں واپس ہو کر مزاحمت نہیں کریں گے۔ تاہم اس نے احتیاطاً چند افسروں اور سپاہیوں کے سوا باقی فوج کو وہیں چھوڑا اور اس کی کمان اپنے بھائی جے رام کے سپرد کر دی۔ فوج کے بعض افسر اس کے واپس جانے پر خوش نہ تھے لیکن گنگارام کی یہ فتح سکھدیو پر آخری فتح کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی تھی۔ وہ راجہ کو اپنی زبان سے فتح کی خوش خبری سنانا چاہتا تھا اور اپنی آنکھوں سے راجہ کے دربار میں اس شخص

کو ذلیل ہوتا دیکھنے کے لیے بے قرار تھا جو پروہت کے برابر بیٹھا کرتا تھا اور جس کی موجودگی میں وہ راجہ کے دربار میں صرف فوج کے ایک معمولی افسر کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ دربار میں سکھدیو کا مقدمہ پیش کرنے کے لیے اسے فوج کے کسی افسر یا سپاہی پر اعتبار نہ تھا۔

کشتیاں دریائے بیاس کے شفاف پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر رقص کرتی ہوئی کنارے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سکھدیو اور کنول ایک دوسرے کے قریب کھڑے دوسرے کنارے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔

سکھدیو نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کنول کی طرف دیکھا اور کہا "کنول! یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اپنے پتا کی موت کا اتنا غم نہ تھا، جتنا تمہارے پتا کی موت کا ہے۔"

اس کے جواب میں کنول کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اُبل پڑے۔ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اچانک کنول کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ بولی: "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

سکھدیو نے پوچھا: "کیا؟"

کنول نے کہا "آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ اسے چھوڑ دو اور مجھے جہاں بھی چاہے لے جاؤ۔ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک اچھوت لڑکی مصیبت کے وقت آپ کا ساتھ دینے کے قابل نہیں؟"

"میرے لیے تم اچھوت نہیں کنول! لیکن خود کو ڈوبتا دیکھ کر میں تمہیں اپنے ساتھ طوفان کی مہیب لہروں کی طرف گھسیٹنا نہیں چاہتا۔ میں تمہاری جان کی قیمت ہزاروں جانوں سے زیادہ سمجھتا ہوں۔

کنول نے پھر اسی مغموم لہجے میں کہا "آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ میں آپ کے ساتھ مرنے کو آپ سے جدا ہو کر زندہ رہنے پر ہزار بار ترجیح دیتی ہوں۔"

کشتیاں کنارے پر آ لگیں۔ سکھدیو اور کنول سپاہیوں کی حراست میں کشتی سے اترے۔

گنگارام نے کہا "سکھدیو! میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں راجہ کے دربار میں ایک عام قیدی کی طرح رسیوں میں جکڑ کر لے جاؤں۔ یہ صرف تمہاری توہین نہیں بلکہ سماج کی توہین ہو گی۔ اس لیے اگر تم وعدہ کرو کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں ابھی کھلوا دیتا ہوں اور تمہیں تمہاری شان کے شایاں گھوڑا بھی دیا جائے گا۔"

سکھدیو نے جواب دیا "یہ وعدہ میں اس صورت میں کر سکتا ہوں کہ تم اس لڑکی کے ہاتھ بھی کھلوا دو اور اسے بھی سواری دینے کا وعدہ کرو۔"

"تمہاری پہلی شرط مجھے منظور ہے۔ اس لڑکی کی رسیاں کھول دی جائیں گی لیکن اچھوت لڑکی کو راجہ کی فوج کا گھوڑا نہیں دیا جا سکتا۔ تمہاری نظروں میں اس لڑکی کی عزت کتنی ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم ایک اچھوت کو اچھوت سے بڑا درجہ نہیں دے سکتے۔"

سکھدیو نے کہا: "اس صورت میں مجھے یہ اجازت دیجئے کہ میں اپنا گھوڑا اسے پیش کر سکوں۔"

"میں یہ بھی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"تو میں پیدل چلوں گا۔"

"بہت اچھا۔ تو آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ بھاگنے کی کوشش نہیں کریں گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"اچھا تو میں آپ کے ہاتھ کھلوائے دیتا ہوں۔" گنگارام نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور انہوں نے سکھدیو اور کنول کے ہاتھ کھول دیئے۔

تھوڑی دیر بعد یہ مختصر سا قافلہ دریائے بیاس کے جنوب میں ایک زرخیز میدان سے گزر رہا تھا۔ چند کوس چلنے کے بعد سکھدیو نے کنول سے کہا "تم تھک گئی ہو گی؟"

کنول نے جواب دیا "نہیں آپ کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔"

دوپہر کے وقت یہ قافلہ ایک چھوٹے سے شہر میں پہنچا۔ رام داس کے اصرار پر وہاں سے کنول کے لیے ایک بیل گاڑی مہیا کی گئی اور سکھدیو کو گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے رضامند کر لیا گیا۔

شام کے وقت یہ لوگ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ رات کے وقت شاہی محلات سے لے کر عوام کے جھونپڑوں تک ہر گھر میں گنگارام کی شاندار فتح اور باغیوں کے سردار کی خوبصورت لڑکی کے ساتھ سکھدیو کے عشق کا چرچا ہو رہا تھا۔ راجہ اور پرجا کو گنگارام کی فتح کی خوشی سے زیادہ سکھدیو کے حسرتناک انجام کا افسوس تھا۔

پروہت کے اصرار پر راجہ نے سکھدیو اور کنول کو رات بھر قید میں رکھنے کا حکم دے دیا۔

---

(۹)

اگلے دن سکھدیو راجہ کے دربار میں سر جھکائے کھڑا تھا وہ اپنے خیال کے مطابق خود کو بے گناہ ثابت کر چکا تھا۔ وہ بار بار کہہ چکا تھا کہ انسان کے دماغ سے نکلا ہوا قانون جس نے کروڑوں انسانوں کے فطری حقوق سلب کر رکھے ہوں۔ مذہب کہلانے کا مستحق نہیں۔ لیکن اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والوں کے نزدیک اس کے خیالات باغیانہ تھے۔ اس نے گنگا رام کے الزامات کی تردید میں ایک لفظ تک نہ کہا اور سارا وقت سماج کے ان دشمنوں کی وکالت کرتا رہا جن کے متعلق سماج کے قانون میں رحم کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

راجہ کو ایک طرف سکھدیو اور اس کے آباؤ اجداد کی خدمات کا لحاظ اور دوسری طرف پروہت اور برہمنوں کے بگڑ جانے کا خوف تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ دیوتا بھی ناراض نہ ہوں اور سکھدیو کی جان بھی بچ جائے لیکن سکھدیو اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کر رہا تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ ایک برہمن اور ایک عام انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ایسی بات تھی جسے سن کر درباریوں کی اکثریت اس کے خلاف ہو گئی تھی اور وہ اپنے یہ الفاظ واپس لینے کی بجائے ان کی تائید میں کئی ایسے دلائل پیش کر چکا تھا جس سے اس کے بہترین دوستوں کو بھی یہ شبہ ہو گیا تھا کہ سکھدیو ایک اچھوت لڑکی پر فریفتہ ہو کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔

راجہ بعض اوقات سکھدیو کی باتوں سے متاثر ہو کر اس کے حق میں کچھ کہنے کا ارادہ کرتا لیکن پروہت کے تیور دیکھ کر اسے حوصلہ نہ پڑتا۔

سکھدیو کو بھی معلوم تھا کہ اس معاملہ میں پروہت کے سامنے راجہ بے بس ہے اور مقدمہ کا فیصلہ سناتے وقت اس کے منہ سے وہی الفاظ نکلیں گے۔ جو

پروہت کے سفاک چہرے پر نقش تھے۔ راجہ کے متعلق وہ جانتا تھا کہ وہ فطرتاً بے رحم نہیں لیکن پروہت کے متعلق اسے یقین تھا کہ اس کا دل پتھر کی مورتیوں سے بھی زیادہ سخت ہے۔

دوپہر تک راجہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ پروہت کو خیال پیدا ہوا کہ شاید راجہ سکھدیو سے ذاتی ہمدردی کی بنا پر اسے سزا دینے سے کتراتا ہے۔ اس نے کہا:

"مہاراج! مجرم جو کچھ کہہ سکتا تھا کہہ چکا اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس کا جرم قابل سزا ہے یا نہیں اور اس بات کا فیصلہ ہماری مرضی سے نہیں ہو گا بلکہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ سماج کا قانون ایسے مجرم کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے راجہ کی عدالت میں ہر مجرم کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرے لیکن یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اپنے گناہوں کو جائز ثابت کرے۔ مہاراج! یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مجرم نے ایک طرف تو ایک نیچ ذات لڑکی کے ساتھ پریم کر کے ہندو دھرم کو ذلیل کیا اور دوسرے حکومت کے باغیوں کی حمایت میں مہاراج کے سیناپتی کے ساتھ لڑائی کی۔ مہاراج! مجھے ڈر ہے کہ اگر اس شخص کے ساتھ ذرہ برابر بھی رعایت کی گئی تو اس قسم کے ہزاروں من چلے نوجوان سماج کے مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

راجہ، پروہت کے فیصلہ کن الفاظ سن کر دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "مقدمے کا فیصلہ آج شام کو سنایا جائے گا۔ مجرم کو قید خانہ میں لے جاؤ۔"

سپاہی سکھدیو کو قید خانے کی طرف لے گئے۔ راجہ نے پروہت، گنگا رام اور چند اور درباریوں کے سوا باقی سب کو رخصت کیا اور ان کے ساتھ مقدمے کے فیصلے کے متعلق مشورہ کرنے لگا۔

(۵)

شام کے وقت شاہی محل سے باہر عورتوں اور مردوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سکھدیو ننگی تلواروں کے پہرے میں لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتا ہوا شاہی دربار میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ راجہ پر پڑی۔ راجہ نے اس کی نگاہ کی تاب نہ لا کر پروہت کی طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔ سکھدیو نے راجہ کے دوسرے مشیروں کی طرف دیکھا اور وہ بھی پروہت کی طرف دیکھنے لگے۔

گنگا رام اور پروہت کے سوا باقی سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ پروہت نے کہا "مہاراج! ملزم مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے منتظر کھڑا ہے۔"

راجہ نے چونک کر پروہت کی طرف دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نہایت مغموم لہجے میں جواب دیا "مقدمے کا فیصلہ آپ سنا دیں" اور پھر اسی طرح آنکھیں نیچی کر لیں۔

پروہت نے سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا "سکھدیو! مہاراج نے اپنی شاہانہ فیاضی سے کام لیتے ہوئے تمہارے بغاوت کے جرم کو معاف کر دیا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ سماج کی توہین کے جرم میں تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔ کل کالی دیوی کے مندر میں تمہارا بلیدان دیا جائے گا۔"

موت کا حکم سننے کے بعد سکھدیو نے پھر ایک بار حاضرینِ دربار کی طرف دیکھا۔ کسی نے اس کے ساتھ آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز اٹھی کہ تو مجرم نہیں۔ مجرم یہ لوگ ہیں جن کی گردنیں ندامت کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہیں تو ان بدنصیب لوگوں میں سے نہیں جو دنیا میں کوئی نقش چھوڑے بغیر فنا ہو جاتے ہیں۔ تمہارے خون کے چھینٹوں سے باغِ ہستی

کے ہزاروں مرجھائے ہوئے پودے پھلیں پھولیں گے۔

ضمیر کی اس آواز نے سکھدیو کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پیدا کر دی لیکن اچانک اسے کنول کا خیال آیا اور یہ مسکراہٹ فنا ہو گئی۔ اسی دل کی دوسری آواز یہ تھی کہ بے شک تیری قربانی ایک بہت بڑی قربانی ہے لیکن تو اپنے بعد اس دنیا میں ایک سرسبز پودا بادِ سموم کے جھونکوں میں چھوڑ کر جا رہا ہے۔

سکھدیو کو اس دنیا میں کنول کی بے کسی اپنی بے کسی نظر آنے لگی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی یہ التجا ٹھکرا دی جائے گی۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور راجہ کے قدموں میں گر پڑا۔

"مہاراج!" اس نے کہا "میں نے جو کچھ کیا درست سمجھ کر کیا لیکن اگر آپ اسے میرا گناہ سمجھ کر میرے لیے موت کی سزا تجویز کرتے ہیں تو میں خوشی سے جان دینے کے لیے تیار ہوں لیکن وہ مظلوم لڑکی بے گناہ ہے اس کا قصور اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ وہ اپنے باپ کی موت کو خاموشی سے برداشت نہ کر سکی۔ مہاراج! اگر میرے باپ دادا کی گزشتہ خدمات آپ پر تھوڑا بہت حق رکھتی ہیں تو اس لڑکی کو معاف کر دیجیے اور اسے عزت کے ساتھ اس کی قوم کے لوگوں میں پہنچا دیجیے۔"

سکھدیو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ آنسو پونچھتا ہوا اٹھا اور راجہ کے چہرے پر اپنی درخواست کا اثر دیکھنے لگا۔ راجہ نے ملتجی سا ہو کر پروہت کی طرف دیکھا لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔ راجہ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور مسند سے اتر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سکھدیو نے پروہت کی طرف دیکھا اور کہا "میں آپ سے رحم کی درخواست نہیں کرتا۔ صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس لڑکی کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے؟"

پروہت نے کہا "میں تمہیں یہ بتا کر تمہاری تکلیف میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا

لیکن اگر تم پوچھنا ہی چاہتے ہو تو سنو! وہ مکّار لڑکی سماج کے ایک ہونہار بیٹے کو اپنے دام میں پھنسا کر اسے بھرشٹ کرنے، اس کی آتما کا ستیاناس کرنے اور اسے سماج کے خلاف بغاوت کے لیے اکسانے کی مجرم ہے۔ تمہارے دل میں اس کے لیے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔ سماج کا قانون اسے قابلِ معافی نہیں سمجھتا۔ مہاراج اس لڑکی کی سزا تجویز کر چکے ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہاری جلتی ہوئی چتا میں پھینک دیا جائے گا۔

پروہت کے ان الفاظ سے سکھدیو کے جسم کا رُواں رُواں غصے سے لرزنے لگا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "ذلیل انسان! کاش تمہیں بھی میری طرح کوئی دھرم لُوٹنے اور آتما کا ستیاناس کرنے والا مل جاتا اور شاید تم بھی ایک وحشی درندے سے انسان بن جاتے۔"

پروہت کی یہ توہین سماج کے بیٹوں کی توقع کے خلاف تھی۔ وہ تمام غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گنگا رام نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ سکھدیو کے بازو پکڑ کر دربار سے باہر لے گئے۔

شاہی محل کے بیرونی دروازے پر سکھدیو کا پرانا رفیق رام داس کھڑا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سکھدیو نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور آنکھیں پھیر لیں۔

آخری سہارا

رات کے وقت قید خانے کی تنہائی میں سکھدیو کے لیے ہر لمحہ ہفتوں اور مہینوں سے زیادہ طویل تھا۔ زندگی کی روشنی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور موت کے اندھیرے اس کے دل و دماغ پر قبضہ جما رہے تھے۔ رات کے سیاہ پردوں میں اسے کالی دیوی کی مہیب تصویر رقص کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن یہ بھیانک اندھیرے موت کے مہیب قہقہوں میں تبدیل ہو کر اس کے کانوں میں گونجنے لگے اس کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چلّانا چاہتا تھا لیکن یہ کیفیت دیر تک نہ رہی اسے کنول کا خیال آیا اور اس ظلمت کدہ میں ہزاروں مشعلیں روشن ہو گئیں وہ تصور میں وہ منظر دیکھنے لگا جب کنول اس سے جدا ہو کر قید خانے کی ایک علیٰحدہ کوٹھری کی طرف جاتے ہوئے اپنی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے اور چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

خیالات کی زنجیر اسے جدائی کے آخری منظر سے ملاقات کے ابتدائی مناظر کی طرف لے گئی۔ گزشتہ واقعات کے باہمی ربط نے اسے پھر ایک بار سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ کشتی کے ڈوب جانے کے بعد زندہ بچ کر کنول کے گھر تک پہنچنے سے اب تک کسی زبردست اور نامعلوم طاقت کے ہاتھوں کھیلتا رہا ہے وہ اپنی مرضی سے بے ہوش ہو کر اچھوتوں کے گھر نہیں پہنچا تھا اسے اپنے ارادے

نے نہیں بلکہ کسی اور کی خواہش نے آم کھانے پر مجبور کر دیا تھا وہ کون تھا جس نے دریا میں آم پھینکتے وقت اس کے ہاتھ روک لیے تھے۔ وہ کون تھا جس نے آدھی رات کے وقت کنول کو آم دے کر بھیجا تھا جس نے اس کے ارادے کے خلاف اس کے من کے مندر سے دیوتاؤں کی تصویریں اٹھا کر ان کی جگہ ایک اچھوت لڑکی کی تصویر رکھ دی تھی وہ کون تھا جس نے دیوتاؤں کے ہوتے ایک نیچی ذات کی لڑکی کو اس کے دل پر قبضہ جمانے کے تمام طریقے سکھا دیئے تھے؟"

ان سوالات پر بار بار غور کرنے سے سکھدیو کا یہ خیال یقین کی حد تک پہنچنے لگا کہ کوئی زبردست اور نامعلوم طاقت آج تک اس کے ہر نئے اقدام پر اس کی راہنمائی کرتی رہی ہے اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہونے لگا کہ شاید وہ زبردست طاقت یہ پسند نہ کرے کہ اس کھیل کا آخری منظر اس کی اور اس کے بعد کنول کی حسرت ناک موت ہو۔ بے کسی اور مایوسی کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے دل نے اس زبردست طاقت کو اپنا آخری سہارا بنا لینے کی تائید کی سکھدیو نے منہ کے بل زمین پر گر کر انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا "اے دیوتا!.... اے دیوتاؤں کے دیوتا....!"

وہ یہاں تک کہہ کر رک گیا اس زبردست طاقت کا جو تصور اس کے دماغ میں موجود تھا دیوتا کے لفظ میں نہیں سما سکتا تھا۔ اس طاقت کی صفات میں اسے دیوتا کی ہیبت کو داخل کرنا نامناسب معلوم ہوا اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنی دعا ان الفاظ میں شروع کی:

"اے مظلوموں اور بے گناہوں کی حمایت کرنے والی زبردست اور انصاف پسند طاقت! میں نے جو کچھ کیا تیرے اشاروں پر کیا۔ اس وقت تو ہی میرا سہارا ہو سکتی ہے

اگر تو ہے تو میں تجھے مدد کے لیے پکارتا ہوں۔ اگر میں سماج کے انصاف کا حقدار نہیں تو تیرے رحم کا حق دار ضرور ہوں۔ اگر دیوتاؤں کی طرح تیرا انصاف بھی مجھے قصور وار ٹھہراتا ہے تو میں خوشی کے ساتھ جان دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک بے گناہ لڑکی کا دردناک انجام مجھے تیرا انصاف نظر نہیں آتا۔ نہیں! تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ کاش تیرے کانوں تک میری آواز پہنچ جائے! اے زبردست طاقت اس وقت تو کہاں ہے؟"

---

(۲)

سکھدیو نے ابھی سر نہ اٹھایا تھا کہ باہر پہرے داروں کی چیخ پکار سنائی دی وہ چونک کر اٹھا اور اپنی تاریک کوٹھڑی کے دروازہ کے ساتھ کان لگا کر سننے لگا۔ تلواروں کی جھنکار سے اس نے اندازہ لگایا کہ باہر پہرے داروں پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ چیخ پکار زخمیوں کے کراہنے تک محدود ہو کر رہ گئی اور سکھدیو نے پاؤں کی آہٹ سے محسوس کیا کہ چند آدمی اس کی کوٹھڑی کی طرف آ رہے ہیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ باہر سے آنے والے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلنے لگے۔ چند دھکوں کے ساتھ دروازہ ایک سخت دھماکے کے ساتھ کھلا۔ سکھدیو جست لگا کر باہر نکلا اور اس نے دیکھا کہ پندرہ بیس آدمی ننگی تلواریں لیے کھڑے ہیں۔ چہروں پر نقاب ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو پہچان نہ سکا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "آئیے میرے ساتھ، جلدی کیجئے! ایک پہرے دار ہم سے بچ کر بھاگ گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں دوسرے سپاہی آ جائیں گے"

سکھدیو اس کی آواز پہچان کر بولا "رام داس! تم؟"

رام داس نے کہا "باتوں کا وقت نہیں۔ آئیے میرے ساتھ!"

سکھدیو نے رام داس کے ساتھ دو تین قدم اٹھائے۔ لیکن پھر رک کر کھڑا ہو گیا۔

رام داس نے برہم ہو کر کہا "چلتے کیوں نہیں آپ! سپاہی ابھی آ جائیں گے، جلدی کیجئے آپ کے لیے گھوڑا تیار کھڑا ہے۔"

سکھدیو نے غمگین لہجے میں جواب دیا "رام داس! مجھ سے زیادہ وہ مظلوم لڑکی تمہارے رحم کی حق دار تھی۔ اگر تم نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی جرأت کی ہے تو مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں اسے خطرے میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔"

رام داس نے کہا "وہ شاید اس کوٹھڑی میں ہے آئیے جلدی کرو۔"

سکھدیو، رام داس اور اس کے ساتھی پہرہ داروں کی لاشوں پر سے گزرتے ہوئے ایک کوٹھڑی کی طرف بڑھے اور ایک زبردست دھکے کے ساتھ دروازہ توڑ ڈالا — کنول پہلے ہی تمام واقعات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ سکھدیو کی آواز بھی اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی وہ دروازہ ٹوٹتے ہی باہر کی طرف لپکی۔ سماج کے چوہے بھاگتے ہوئے قید خانے کی حدود سے باہر نکل آئے۔

ایک شخص آم کے ایک درخت کے نیچے گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ رام داس نے کہا "جلدی کیجئے! شاید بھاگنے والے پہریدار نے فوج کو خبردار کر دیا ہے۔ سنیئے! قلعے کی طرف سے آوازیں آ رہی ہیں۔"

سکھدیو جلدی سے گھوڑے پر سوار ہوا اور کنول کو اپنے بازو کا سہارا دے کر پیچھے بٹھا لیا۔

رام داس نے سکھدیو کو اپنی تلوار، کمان اور ترکش پیش کرتے ہوئے کہا۔

"لیجئے! شاید آپ کو ان کی ضرورت پڑے۔ وہ آپ کے تعاقب میں آتے ہی ہوں گے۔ آپ جنگل کا رخ کریں وہ غالباً دریا کی طرف توجہ کریں گے۔"

سکھدیو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ کنول اس کی کمر کے ساتھ لپٹ گئی۔ گھوڑا ایک دوجست لگانے کے بعد رات کے سیاہ پردوں میں غائب ہو گیا۔

رام داس سپاہیوں کو ادھر ادھر فرار ہونے کا حکم دے کر دیر تک وہاں کھڑا گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنتا رہا۔ یہ آواز بتدریج کم ہوتی ہوتی ختم ہو گئی اور قلعے کی طرف سے آنے والی آوازیں صاف طور پر سنائی دینے لگیں۔

---

(۳)

رام داس کا یہ قیاس کہ جان بچا کر بھاگنے والا سپاہی فوج کو خبردار کر چکا ہوگا صحیح نکلا لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ سماج کے سپاہی سکھدیو کے تعاقب کے لیے صرف دریا کا رخ کریں گے۔ گنگا رام نے اس واقعہ سے باخبر ہوتے ہی شہر کے چاروں طرف سوار دوڑا دیئے اور خود ایک دستے کے ساتھ جنگل کا رخ کیا۔

سکھدیو ابھی شہر سے تین کوس دور گیا تھا کہ اسے پیچھے سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایک کوس اور طے کرنے کے بعد وہ گھنے جنگل میں پہنچ چکا تھا لیکن تعاقب میں آنے والے سوار بہت قریب آ چکے تھے۔ سکھدیو نے بھاگتے ہوئے تعاقب کرنے والوں کے تیروں کا شکار ہونے کی بجائے گھنے جنگل اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھانا بہتر خیال کیا۔

اس نے گھنی جھاڑیوں میں گھوڑا روکا اور نیچے کود کر کنول کو اترنے کے لیے سہارا

دیا اور لگام اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اسے خاموش کھڑے رہنے کی ہدایت کی۔

گنگارام نے گھنے اور تاریک جنگل میں سکھدیو کا کوئی سراغ نہ پاکر سواروں کو گھوڑے روکنے کا حکم دیا۔

سکھدیو تاریکی میں گنگارام کے ساتھیوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا تاہم اس کے خیال کے مطابق ان کی تعداد پندرہ سے زیادہ اور بیس سے کم تھی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد گنگارام کی آواز آئی "میرا خیال ہے کہ اگر وہ اس طرف آیا ہے تو زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ آگے جنگل اس قدر گھنا ہے کہ اندھیری رات میں گھوڑا بھگانا آسان نہیں وہ کہیں ادھر ادھر چھپ کر صبح کا انتظار کرے گا صبح تک ہمیں بھی اس کو اسی علاقہ میں تلاش کرنا چاہیئے۔ دن کی روشنی میں ہم اس کا کھوج نکال لیں گے۔"

گنگارام کی آواز پہچان کر سکھدیو کا خون کھولنے لگا۔

گنگارام پھر بولا "ہمیں یہاں سے دو دو تین تین آدمیوں کی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر اس علاقے کو صبح تک اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے۔"

ایک سپاہی بولا "لیکن مہاراج ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ سکھدیو اکیلا نہیں۔ شاید وہ لوگ جو پندرہ بیس پہرہ داروں کو قتل کر کے اسے نکال لائے ہیں اس کے ساتھ ہوں اور وہ دو تین آدمیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا پسند نہ کریں۔ مجھے تو یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ ادھر اُدھر چھپ کر ہمارا انتظار نہ کر رہے ہوں۔"

گنگارام نے جواب دیا "بزدل نہ بنو۔ بھاگنے والے مقابلہ نہیں کیا کرتے تھوڑی دیر میں ہماری پیادہ فوج پہنچ جائے گی۔ اس وقت ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ اس جنگل میں ہیں یا نہیں۔"

گنگارام کی باتوں سے سکھدیو آنے والے خطرات کا اندازہ لگا کر ایک فیصلے

پر پہنچ چکا تھا ادھر گنگارام نے اپنا آخری فقرہ پورا کیا اور ادھر ایک تیر سکھدیو کی کمان سے نکل کر اس کی پسلی میں پیوست ہوگیا۔

گنگارام نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنا سر زین کے ہتھے پر ٹیک دیا۔ سپاہی ابھی ہوشیار نہ ہوئے تھے کہ چار پانچ اور تیر یکے بعد دیگرے مختلف آدمیوں کو لگے۔ ایک سپاہی نے چلا کر کہا "وہ یہیں ہیں سینا پتی مارے گئے۔ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ بھاگو! بھاگو!!"

ایک تیر ایک گھوڑے کو لگا اور اس نے تمام گھوڑوں میں کھلبلی مچا دی۔ گنگارام کو گرتا دیکھ کر ایک شخص نے پھرتی سے اپنا گھوڑا آگے کیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے گھوڑے پر ڈال لیا اور باگ موڑلی۔ باقی سپاہی اس کے پیچھے ہو لیے اور آن کی آن میں میدان خالی ہوگیا۔

سکھدیو نے کنول کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہا "کنول! اگر آج میں تمہارے باپ کی موت کا انتقام لینے میں کوتاہی کرتا تو مجھے ساری عمر افسوس رہتا۔"

کنول نے پوچھا "وہ بھی ان کے ساتھ تھا؟"

"میرا پہلا تیر اسی کے سینے میں لگا تھا۔ اب جلدی کرو ہمیں راتوں رات یہ جنگل عبور کر لینا چاہیئے۔" سکھدیو یہ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور کنول کو سہارا دے کر پیچھے بٹھا لیا۔

شہروں سے دُور

افق مشرق سے شب کی ردائے سرمگیں سمٹنے لگی اور صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ گھنے جنگل میں درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپک کر سرسبز گھاس پر گر رہی تھیں۔ سکھدیو اور کنول تھکے ہوئے گھوڑے سے اتر پڑے۔ اس روح پرور تنہائی میں ان کے دل محبت، آزادی اور مسرت کے دلکش راگ الاپ رہے تھے زندگی اپنی دلفریب حقیقتوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

کنول نے غیر ارادی طور پر ایک شاخ پکڑ کر پتے توڑنے کی کوشش کی شاخ میں ہلکی سی جنبش کے ساتھ شبنم کے چند قطرے سکھدیو پر گرے اور وہ پریشان ہو کر رہ گئی۔ سکھدیو نے مسکراتے ہوئے ایک شاخ کو پکڑ کر ہلایا اور خود چھینٹوں سے بچنے کے لیے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

کنول ہنستے ہوئے کپڑے جھاڑنے لگی "میں بارش سے نہیں ڈرتی جب آپ ساتھ ہوں میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔"

سکھدیو بولا "کنول! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم مر کر پھر زندہ ہوئے ہیں۔"

کنول نے پوچھا "آپ کو یقین ہے کہ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں؟"

سکھدیو نے جواب دیا "اب ہم خطرے کی حدود سے باہر آ چکے ہیں۔ دو تین کوس آگے چل کر ہم ریاست کی سرحد سے پار ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ گنگا رام کا انجام دیکھ کر اول تو راجہ خود ہی میرے تعاقب میں کسی کو نہیں بھیجے گا

اور اگر یہ مہم کسی کے سپرد کی بھی گئی تو جب تک وہ ہمارے گھوڑے کا کھوج نکالتا ہوا اس جگہ پہنچے گا ہم سرحد پار کر کے کئی کوس آگے جا چکے ہوں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہمارا گھوڑا بھی تازہ دم ہو جائے گا۔"

دو خوبصورت چڑیاں اڑتی ہوئی آئیں اور سامنے شاخ پر تھوڑی دیر بیٹھ کر چہچہانے کے بعد پھر اڑ گئیں۔

سکھدیو کے منہ سے بے اختیار "آزادی" کا لفظ نکلا اور اس نے کنول کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "کنول تمہیں معلوم ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

کنول نے کہا "جب تک آپ ساتھ ہیں مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔"

سکھدیو نے کہا "میں کچھ دیر پہلے یہ سوچتا تھا کہ اس دنیا میں شاید ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں لیکن ان چڑیوں کو دیکھنے کے بعد میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ اس دنیا میں ہزاروں ایسی جگہیں موجود ہیں جہاں صرف آزادی کی حکومت ہے خوش الحان پرندوں کی طرح ہم بھی جس جگہ دو گھڑیاں گزارا کریں گے اسے اپنا گھر سمجھ لیا کریں گے۔"

کنول نے کہا "لیکن پرندے بھی وقت پر اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھتے ہیں ہمیں کوئی نہ کوئی آرام کی جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔"

سکھدیو نے قدرے مغموم لہجے میں کہا "کنول! اب میں کسی شہر میں نہیں جا سکتا اور کسی ایسی بستی میں بھی پاؤں نہیں دھر سکتا۔ جہاں اونچی ذات کے لوگ رہتے ہوں مجھے یا تو اپنی باقی عمر کسی ویران جگہ میں گزارنی ہو گی یا اچھوتوں کی کسی بستی میں پناہ لینا پڑے گی۔ یہ غریب لوگ تمہارے پتا کی طرح بے یار و مددگار لوگوں کو خوشی سے پناہ دیں گے۔ میں ان لوگوں کی زندگی اختیار کروں گا ان کے ساتھ بکریاں چرایا کروں گا اور تم ......!"

"اور میں" کنول نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے پوچھا۔

سکھدیو نے کہا "اور تم میرے دل کے مندر کو آباد کرو گی۔ یہ دیوتاؤں کے روٹھ جانے سے سنسان ہو گیا ہے لیکن یہ آنسو! کنول مجھے تمہاری مصیبت کا دکھ ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنی زندگی میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

کنول نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میں آپ کے ساتھ ہر تکلیف خوشی سے برداشت کروں گی لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ آرام کی زندگی چھوڑ کر یہ تمام مصیبتیں اٹھائیں گے۔ میری وجہ سے آپ دوستوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر اچھوتوں میں گمنام ہو کر رہیں گے۔"

"کنول یہ نہ کہو۔ اگر میں ایک راجہ بھی ہوتا تو بھی اپنی تمام زندگی کو تمہارے ساتھ ان چند لمحات کی خوشی کی قیمت نہ سمجھتا۔ اگر میری طرح یہ بڑے بڑے محلوں میں رہنے والے اونچی ذات کے لوگ اس خوشی اور آزادی کی نعمت سے واقف ہو جائیں جس کا طوفان میرے دل میں موجیں مار رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے محلات چھوڑ کر پھر ایک بار ایسے جنگلوں میں گھاس پھونس کی جھونپڑیاں تعمیر کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔"

کنول دیر تک ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی رہی اس کے چہرے سے حزن و ملال کے بادل چھٹ چکے تھے اور اس کے حسن و جمال کا نکھار سکھدیو کے دل و دماغ کی تمام قوتوں کو مغلوب کر رہا تھا۔ وہ جذبۂ عبودیت جس نے زمین و آسمان کی زبردست قوتوں کے سامنے سربسجود ہونا سیکھا تھا اب اسے ایک اچھوت لڑکی کے سامنے سر جھکا دینے پر آمادہ کر رہا تھا لیکن سکھدیو اپنی اس شکست کو اپنے مردانہ وقار کی توہین سمجھتے ہوئے سنبھل گیا اور چونک کر بولا "کنول چلو!

ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

یہ دونوں پھر ایک بار تھکے ماندے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

---

(۲)

شام ہونے کو تھی سکھدیو اور کنول ایک ندی کے کنارے اترے۔ سکھدیو نے گھوڑے کی زین اتاری اور اسے گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود سرسبز گھاس پر لیٹ گیا۔ کنول اس کے قریب بیٹھ گئی۔

سکھدیو نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ ہاں کنول تمہیں بھوک تو بہت لگ رہی ہو گی؟"

"ہم دونوں بھوکے ہیں۔" کنول نے جواب دیا۔

"آج رات تو شاید پانی پی کر ہی گزارا کرنا پڑے۔ صبح سویرے ہم چرواہوں کی کسی نہ کسی بستی میں پہنچ جائیں گے۔ اگر گھوڑے میں آگے چلنے کی ہمت ہوتی تو ہم آج ہی چرواہوں کی کوئی نہ کوئی بستی تلاش کر لیتے لیکن وہ جواب دے چکا ہے میں تھوڑی دیر سستانے کے بعد ادھر ادھر دیکھتا ہوں اگر کوئی چرواہا نظر آیا، تو تمہارے لیے دودھ لے آؤں گا۔"

"آپ تھکے ہوئے ہیں آرام کریں۔ مجھے اتنی بھوک نہیں۔ صبح دیکھا جائیگا میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گی۔"

سورج غروب ہو چکا تھا اور افقِ مغرب پر بکھرے ہوئے بادلوں کے چند ٹکڑوں کی سرخی پر سیاہی غالب آ رہی تھی۔ شام کی خنک ہوا کے جھونکے ندی کے صاف اور شفاف پانی پر ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ آسمان

پرستاروں کا کارواں نمودار ہونے لگا اور ہوا کی خنکی بڑھنے لگی۔ سکھدیو اٹھ کر کنول کے قریب بیٹھ گیا۔

"کنول؟"

"مہاراج!"

"میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور کبھی جدا نہیں ہوئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ستاروں کی چھاؤں میں میں پہلے بھی کئی بار تمہارے ساتھ باتیں کر چکا ہوں۔ شاید پچھلے جنم میں ہم دونوں اچھوت تھے اور موت کے بعد کسی پرانے پاپ کی وجہ سے ہم ان جنم میں ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے لیکن زندگی اور موت کا یہ ہیر پھیر ہماری محبت کی زنجیریں نہ توڑ سکا اور ہم نے پھر ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا۔"

کنول نے جواب دیا کہ میں نہیں سمجھی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو بار بار یہی خیال آتا ہے کہ آپ مجھ پر ترس کھا کر میری تسلی کے لیے یہ باتیں کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہو کہ پچھلے جنم میں ہم دونوں اچھوت تھے تو مجھے ڈر ہے کہ وہ رشتہ جو ہمارے درمیان اس وقت قائم تھا۔ اب شاید قائم نہ ہو سکے۔"

"کونسا رشتہ؟ کنول! تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے سوا باقی تمام رشتے توڑ چکا ہوں میرے لیے زندگی اب صرف تم ہو۔" سکھدیو نے کسی حد تک جذبات سے مغلوب ہو کر کنول کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

کنول نے حیا سے مغلوب ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا "مجھے آپ کی محبت سے انکار نہیں لیکن رشتے سے میری مراد مرد اور عورت کا جائز تعلق ہے جو شاید ایک ہی ذات کے لوگوں میں ہو سکتا ہے۔ جب آپ کسی بستی میں داخل ہوں گے تو لوگ آپ سے پوچھیں گے کہ یہ آپ کی کون ہے آپ انہیں کیا جواب دیں گے؟

شاید آپ کا یہ جواب کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں کافی نہ ہو اور ان کی نظر اس زنجیر تک نہ پہنچ سکے جس کے ساتھ ہمارے دل بندھے ہوئے ہیں کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ وہ مجھے ایک آوارہ عورت سمجھیں اور طرح طرح کی باتیں کریں؟"

سکھدیو نے کہا "کنول! جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو وہ میں سمجھ چکا ہوں۔ جائز تعلق سے تمہاری مراد شوہر اور بیوی کا تعلق ہے۔ دیکھو کنول! اگر تم چاہو تو میں آج سے تمہارا پتی کہلانے کے لیے تیار ہوں۔ . . . میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ رشتہ جوڑنے کے لیے پروہت کے بھجن اور شہنائیوں کی ضرورت نہیں اور شاید ہمیں کوئی ایسا پروہت مل بھی نہ سکے اس لیے یہ رشتہ ہم سماج کے سامنے نہیں بلکہ اس زبردست طاقت کے سامنے جوڑتے ہیں جس نے ہمیں ایک دوسرے سے ملایا اور سماج کی زبردست کوشش کے باوجود ہمیں موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ زبردست طاقت اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ان ستاروں کی آنکھوں سے ہمیں ایک جگہ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے میں اس کا نام نہیں جانتا لیکن جو میں کہوں تم بھی کہو۔"

سکھدیو نے کنول کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ کہنا شروع کیا:

"اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! تو گواہ ہے کہ ہم آج شوہر اور بیوی کا رشتہ جوڑتے ہیں ہم مرتے دم تک ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے ہم صرف ایک دوسرے کے لیے زندہ رہیں گے۔ اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! ہماری مدد کر۔"

کنول نے دبی زبان سے سکھدیو کے یہ الفاظ دہرا دیئے۔

سکھدیو کی نگاہیں ستاروں سے باتیں کر رہی تھیں کنول کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔

سکھدیو نے کہا "کنول! میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس زبردست طاقت کا نام محبت یا محبت کا مرکز ہونا چاہیئے۔"

لیکن سکھدیو کی موجودگی میں کنول نے کسی اور طاقت کے تصور کی ضرورت محسوس نہ کی اور اس نے آگے جھک کر سکھدیو کے پاؤں چھو لیئے۔

"نہیں! نہیں کنول!" سکھدیو نے یہ کہتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا دونوں نے لرزتی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنی ایک دوسرے کے تنفس کی حرارت محسوس کی اور دونوں کے کانپتے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

کنول نے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں ؟"

سکھدیو نے جواب دیا "نہیں! یہاں کوئی خطرہ نہیں ہم اپنی ریاست کی سرحد سے بہت دور آ چکے ہیں۔ اونچی ذات والوں کے شہر یہاں سے کوسوں دور ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمیں اس غیر آباد علاقے میں آزاد قوم کے چرواہوں کی کوئی نہ کوئی بستی مل جائے۔"

---

(۱۱)

پچھلی رات کی چاندنی میں سکھدیو اور کنول نے ندی عبور کی۔ کنول گھوڑے پر سوار تھی اور سکھدیو اس کی لگام ہاتھ میں لیے آگے آگے چل رہا تھا۔

وہ دیر تک سفر کرتے رہے لیکن چرواہوں کی بستیوں کا کوئی نشان نہ ملا راستے میں پانی کی کمی نہ تھی لیکن بھوک ان دونوں کو نڈھال کر رہی تھی۔ تھکا ماندہ گھوڑا چلتے چلتے رک جاتا اور گھاس کے چند تنکے نوچنے کے بعد پھر چل پڑتا۔

دوپہر کے وقت انہیں درختوں کے درمیان چند بھیڑیں اور بکریاں چرتی ہوئی نظر آئیں اور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف سے بنسری کی دلکش آواز سنائی دی۔ سکھدیو اور کنول بھیڑوں کے قریب پہنچے۔ ایک درخت کے نیچے کسی کا پھٹا پرانا بستر، ایک مٹی کا پیالہ اور مچھلیاں پکڑنے والا ایک چھوٹا سا جال پڑا تھا لیکن انہیں بنسری بجانے والا نظر نہ آیا۔ سکھدیو نے کنول کو گھوڑے سے اتار کر گھوڑا ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور دونوں درختوں کے جھنڈ میں بنسری بجانے والے کو تلاش کرنے لگے۔

"وہ دیکھیے!" کنول نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سکھدیو نے اوپر نگاہ کی تو اسے درخت کی گھنی ٹہنیوں کے درمیان ایک انسان کی صورت دکھائی دی۔

"کیوں بھائی نیچے نہیں آؤ گے ؟" سکھدیو نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کون!" بنسری بجانے والے نے چونک کر کہا اور اس کے ساتھ ہی بنسری اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔

سکھدیو نے کہا "بھائی! ہم مسافر ہیں۔ بہت تھکے ہوئے ہیں —— اور بہت بھوکے!"

چرواہا درخت کی ٹہنیوں کے ساتھ لٹکتا ہوا نیچے اترا۔ اور سکھدیو اور کنول کی طرف پریشان سا ہو کر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر گھوڑے پر پڑی اور اس نے پوچھا:

"یہ گھوڑا تمہارا ہے ؟"

سکھدیو نے جواب دیا "ہاں ہمارا ہے!"

"بہت خوبصورت گھوڑا ہے۔ میں نے ایسا گھوڑا کبھی نہیں دیکھا تم

"کس دیس کے رہنے والے ہو؟"

"ہم دُور دیس کے رہنے والے ہیں۔"

"آپ شاید میری بنسری کی آواز سن کر اِدھر آئے ہیں؟"

"ہاں تم بنسری بہت اچھی بجاتے ہو۔"

"آپ اسے پسند کرتے ہیں؟ سنیئے میں پھر بجاتا ہوں۔ یہ کہہ کر چرواہے نے جلدی سے بنسری اُٹھائی اور ہونٹوں کے ساتھ لگا لی۔

سکھدیو نے کہا "بھائی ٹھہرو، ہم آرام سے بیٹھ کر تمہاری بنسری سنیں گے پہلے ہماری بھوک کا علاج کرو۔"

"آپ بھوکے ہیں؟"

سکھدیو نے جواب دیا "دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔"

"اوہو! مجھے آتے ہی کیوں نہ بتایا؟"

"بتایا تھا لیکن تم نے سنا نہیں۔"

"بس میں ابھی آتا ہوں۔" چرواہا یہ کہہ کر وہاں سے بھاگا اور آن کی آن میں چند بکریاں گھیر کر درخت کے نیچے لے آیا اور مٹی کا پیالہ اٹھا کر دودھ دوہنے لگا۔ سکھدیو اور کنول درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ چرواہے نے پہلا پیالہ بھر کر سکھدیو کو پیش کیا۔ سکھدیو نے کنول کو پیش کرنا چاہا لیکن اس نے "پہلے آپ" کہہ کر انکار کر دیا۔ سکھدیو نے ایک دو دفعہ اصرار کیا تو چرواہے سے نہ رہا گیا اور وہ بولا "ہمارے ملک میں تو کھانے پینے کی باتوں میں مرد پہل کرتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ملک کا رواج اُلٹا ہے۔"

کنول اس پر ہنس پڑی اور سکھدیو نے مسکراتے ہوئے پیالہ منہ سے لگا لیا۔

کنول اور سکھدیو نے سیر ہو کر دودھ پیا لیکن چرواہے کی تسلی نہ ہوئی اور

جب تک ان دونوں کی قوتِ برداشت نے جواب نہ دے دیا اور وہ پینے کے لیے اصرار کرتا رہا۔

سکھدیو نے پوچھا: "بھائی چرواہے تمہارا کیا نام ہے؟"

"بدھو" چرواہے نے جواب دیا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"یہاں سے تین کوس کے فاصلے پر دریائے راوی کے قریب ہماری بستی ہے۔"

"دریا وہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"ایک کوس۔"

"تمہاری بستی میں کتنے لوگ آباد ہیں؟"

"بہت ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

چند اور سوالات کے بعد سکھدیو کو معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے چرواہوں کی اور بہت سی بستیاں آباد ہیں اور ان بستیوں کے اکثر لوگ بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔ بعض مچھلیاں پکڑ کر گزارہ کرتے ہیں۔

سکھدیو کے سوالات کا جواب دینے کے بعد چرواہے نے پوچھا "آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں؟"

سکھدیو نے اس کے جواب میں اپنی داستان مختصر طور پر بیان کر دی۔ بدھو سکھدیو کی آپ بیتی کا کچھ حصہ سمجھا، کچھ نہ سمجھا۔ لیکن وہ یہ جان چکا تھا کہ ایک حسین جمیل لڑکی اور ایک خوش وضع نوجوان مصیبت میں ہیں اور یہ احساس اس کے دل میں ہمدردی کے انتہائی جذبات بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔

سکھدیو کی سرگزشت کے اختتام پر بدھو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہمدردی

کے گہرے جذبات جو اس کے دل میں کروٹیں لے رہے تھے، اُن کے اظہار کے لیے اسے اپنی تمام عمر میں سیکھے ہوئے الفاظ ناکافی نظر آنے لگے۔ اس نے دل و دماغ اور زبان کی تمام کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا:

"آپ نے بہت مصیبت اٹھائی ہے آپ میرے ساتھ چلیں۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے بہت خوشی ہو گی۔ ہمارا سردار بہت اچھا آدمی ہے وہ آپ کی رہائش کا انتظام کر دے گا ورنہ میری جھونپڑی آپ کے لیے کافی ہو گی۔ میں اکیلا ہوں اپنے لیے اور جھونپڑی بنا لوں گا۔"

سکھدیو نے بدھو کے ان سیدھے سادے الفاظ کے خلوص سے متاثر ہو کر احسان مندی کے اظہار کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس نے اٹھ کر درخت سے گھوڑے کا رسّا کھولا۔ اس کی زین اور لگام اتار کر نیچے پھینک دی اور اسے تھپکی دینے کے بعد ایک طرف ہانک دیا۔

گھوڑا چند قدم آہستہ آہستہ چلنے کے بعد گھاس میں چرنے لگا۔

سکھدیو نے ایک پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینکا اور وہ سرپٹ بھاگ اٹھا۔

بدھو کچھ دیر بھاگتے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر سکھدیو کی طرف دیکھ کر بولا۔ "گھوڑا بہت دور چلا گیا ہے۔ شاید واپس نہ آئے۔ میں پکڑ لاؤں؟"

سکھدیو نے جواب دیا "نہیں ہمیں اب اس کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ پیدل چلیں گے۔"

بدھو اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور نہ ہی اس نے اس حماقت کی پوری وجہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ تاہم سکھدیو نے اس کی تسلی کے لیے مزید تشریح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا "ہم تینوں سماج کے چور ہیں۔ دو

کو شاید آپ کے جھونپڑے پناہ دے سکیں لیکن گھوڑے کو چھپا کر رکھنا مجھے مشکل نظر آتا ہے۔"

اس جواب نے بدھو کو اور بھی پریشان کر دیا۔ وہ سکھدیو کو یہ رعایت دے سکتا تھا کہ اپنے آپ کو جو چاہے سمجھے لیکن اسے یہ حق نہیں دے سکتا تھا کہ وہ ایک حسین عورت کو خواہ وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو لوگوں کے سامنے بدنام کرتا پھرے۔ کنول کی مصیبت کا حال سنتے ہی اس کے دل میں برادرانہ شفقت کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا اور اسے بہن کہہ کر پکارنے کا ارادہ بھی کر چکا تھا۔

سکھدیو اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر مسکرایا اور بولا "چور سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے کوئی چوری کی ہے میرا مطلب یہ تھا کہ ہم سماج کی قید سے بھاگ آئے ہیں۔ اچھا بھائی! اب بنسری سناؤ۔"

بدھو بنسری بجانے کے معاملے میں کسی کی درخواست ٹھکرانے کا عادی نہ تھا۔ اس نے فوراً بنسری اٹھائی اور گھاس پر بیٹھ کر ایک دل کش ترانہ شروع کیا۔ سکھدیو کو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ سیدھا سادہ چرواہا موسیقی کی تمام لطافتوں سے آشنا ہے۔

درختوں کے سائے ڈھل رہے تھے لیکن بدھو کے ترانے ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔

سکھدیو نے اس کو ذرا تازہ دم ہو لینے کا موقع دینے کی نیت سے کہا "بدھو! تم بنسری بہت اچھی بجاتے ہو۔ یہ راگ تمہیں کس نے سکھائے ہیں؟"

"یونہی جنگل میں پھرتے پھرتے سیکھ گیا۔"

"یہاں سے کب واپس چلو گے؟"

بدھو نے درختوں کا سایہ دیکھ کر کہا "میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیئے۔

شام قریب آرہی ہے آپ یہیں ٹھہریں میں بکریاں گھیر لاؤں۔"

---

(۴)

شام کے وقت جب بستیوں میں کتوں کی چیخ پکار چرواہوں اور ماہی گیروں کے اپنے اپنے گھر لوٹنے کا پتہ دے رہی تھی۔ سکھدیو اور کنول، بدھو کے ساتھ ایک ٹیلے پر سے گزر رہے تھے۔ یہاں سے انہیں وہ جھیل دکھائی دی جس کے اردگرد چرواہوں کی بستیاں آباد تھیں۔ ان بستیوں سے کچھ دور انہیں دریا کا چمکتا ہوا پانی بھی نظر آرہا تھا۔ ٹیلے سے نیچے اتر کر وہ جھیل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ایک بستی میں داخل ہوئے۔

بستی کے چھوٹے چھوٹے لڑکے حسبِ معمول ہنستے، اچھلتے اور کودتے ہوئے بدھو کے استقبال کو نکلے لیکن اس دفعہ "بھیا بدھو" کے ساتھ دو غیر مانوس صورتیں دیکھ کر انہوں نے بے تکلف ہونے کی جرأت نہ کی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے دبی زبان میں کچھ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھر کی راہ لی اور آن کی آن میں تمام بستی میں یہ منادی کرادی کہ بھیا بدھو، جنّ، پریوں اور بھوتوں کی کہانیاں سنایا کرتا تھا ان میں سے دو کو اپنے ساتھ لے آیا ہے۔

بدھو نے اپنے گھر پہنچ کر جھونپڑی میں سے دو چارپائیاں نکال کر باہر ڈال دیں اور سکھدیو اور کنول کو بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر میں گاؤں کی عورتیں اور مرد بدھو کے گھر میں جمع ہو گئے اور وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ بدھو سے بیسیوں سوالات کرنے کے بعد لوگ صرف اتنا جان سکے کہ یہ لڑکی ایک بہت بڑے سردار کی بیٹی ہے ان کے ملک میں ایک بہت بڑا راجہ تھا۔ اس نے اس لڑکی کے باپ کو قتل

کر کے اس لڑکی کو قید کر لیا۔ اس نوجوان کے پاس بہت سی فوجیں تھیں۔ اس نے راجہ کے ساتھ جنگ کی لیکن راجہ نے اسے بھی قید کر لیا۔ اس کے بعد ایک رات یہ دونوں قید خانے کے دروازے توڑ کر باہر نکلے اور راجہ کی فوجوں کو فنا کرتے ہوئے بھاگ آئے۔ اب یہ بدھو کے پاس رہیں گے۔

بدھو کی یہ کہانی کئی زبانوں کے مرچ مسالے کے ساتھ ان لوگوں کے بڑے سردار موتی تک بھی جا پہنچی تھوڑی دیر میں وہ بھی لاٹھی ٹیکتا، کھانستا ہانپتا آموجود ہوا۔ موتی کو دیکھ کر لوگ پاس ادب سے ادھر ادھر ہٹ گئے۔ بدھو بھاگتا ہوا پڑوس کی جھونپڑی سے ایک اور چارپائی لے آیا اور موتی کو اس پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

بوڑھا سردار بدھو کے عجیب و غریب بیان اور اس پر لوگوں کی مبالغہ آرائی سے پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا۔ اب سکھدیو کے چہرے کا رعب و جلال دیکھ کر اور بھی سہم گیا اور اس نے بیٹھنے کی بجائے آگے جھک کر سکھدیو کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن سکھدیو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کر کہنے لگا۔ "مجھے شرمندہ نہ کریں آپ بزرگ ہیں۔"

"نہیں مہاراج! میں آپ کا خادم ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کی فوجوں نے راجہ کا مقابلہ کیا ہے۔ آپ گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سواری کرتے ہیں اور آپ کی بیوی کسی بہت بڑے سردار کی لڑکی ہے جسے راجہ نے کسی دشمنی کی وجہ سے قید میں ڈال دیا تھا اور آپ راجہ کے ہزاروں سپاہیوں کو قتل کر کے اپنی بیوی کو اس کی قید سے نکال لائے ہیں۔ آپ اپنا ملک چھوڑ کر ہمارے پاس آئے ہیں۔ آپ کی سیوا ہمارا فرض ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کے دشمن آپ کا پیچھا کرتے کرتے اس جگہ نہ پہنچ جائیں اور ہماری شامت نہ آجائے۔"

سکھدیو نے جواب دیا: "یہ علاقہ ہماری ریاست کی حدود سے بہت دور ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس طرف نہیں آئے گا اس کے علاوہ راجہ کے ساتھ میری کوئی خاص دشمنی نہیں وہ میرا دوست تھا لیکن اس تمام مصیبت کی وجہ میرے ساتھ راجہ کی فوج کے ایک افسر کی ذاتی دشمنی تھی اس نے میری بیوی کے باپ کو قتل کیا تھا لیکن اب وہ مارا جا چکا ہے اور مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں اب آپ اگر چاہیں تو ہمیں پناہ دیں ورنہ ہم کوئی اور جگہ تلاش کر لیں گے۔"

موتی نادم سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "ہمارے جھونپڑے آپ کے لیے کھلے ہیں یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں آپ سے یہ سارا قصہ سننا چاہتا ہوں۔ مجھے بہادروں کے کارنامے سن کر بہت خوشی ہوتی ہے"

یہ کہہ کر سردار نے لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا: "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنے اپنے گھر۔" سردار کا یہ حکم سن کر تمام مرد اور عورتیں بدھو کے گھر سے نکل گئے۔

سردار نے سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا:

"ہاں کہیے!"

سکھدیو نے اپنا قصہ ذرا تفصیل کے ساتھ شروع کیا۔ بستی کے چند سرکردہ آدمی جو سردار کا حکم سن کر ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔ سردار کے انہماک سے فائدہ اٹھا کر جھجکتے ہوئے سکھدیو کے قریب آ کر زمین پر بیٹھ گئے۔

موتی کے لیے اس داستان کا کوئی حصہ دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ سکھدیو کی داستان کے اختتام پر وہ بولا:

"معاف کیجیے جو سب سے ضروری بات تھی۔ اس کا ابھی تک ذکر نہیں آیا۔ آپ کو دو دن میں صرف دودھ ملا ہے۔ آپ بہت بھوکے ہوں گے لیکن یہ بدھو کا قصور ہے۔ ارے بدھو! جاؤ جلدی کرو۔ ہمارے گھر سے کھانا لے آؤ"

بدھو نے کہا "مہاراج! کھانا تو ادھر بہت جمع ہو گیا ہے۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ لوگ جائیں اور میں ان کے آگے کھانا رکھوں۔"

سردار کو بدھو کی سادہ دلی سے اُنس تھا اور وہ اس کی ہر اُلٹی سیدھی بات پر مسکرانے کا عادی تھا اس نے کہا: "ہم جانتے ہیں بھائی! لیکن کھانا تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

"مہاراج! آپ کا نوکر کالو روٹیاں لے آیا ہے۔ دولو مچھلیاں دے گیا ہے۔ مائی سنتی مکھن کا ایک کٹورا بھر کر دے گئی ہے۔ باگو بھنے ہوئے گوشت کی دو رانیں دے گیا ہے اور لوگ بہت کچھ لے کر آئے تھے لیکن میں نے واپس کر دیا۔"

موتی نے کہا "اچھا تم انہیں کھانا کھلا کر میرے گھر لے آؤ۔ سردی میں ان کا باہر سونا ٹھیک نہیں اور تمہاری جھونپڑی بہت تنگ ہے۔"

بدھو نے کہا "نہیں مہاراج! میں خود باہر سو جاؤں گا اور جھونپڑی میں دو چارپائیاں آسانی سے آ سکتی ہیں۔ کم از کم آج انہیں میرے پاس ضرور رہنے دیں۔"

سکھدیو نے بدھو کی سفارش کی۔ موتی رضامند ہو کر اپنے گھر چلا گیا لیکن بدھو کی بے سروسامانی کا احساس کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر سے اون کی دو چادریں اور دو بچھونے بھیج دیے۔

اگلے روز سکھدیو موتی کا مہمان تھا اور ایک ہفتے کے بعد آس پاس کی بستیوں کے لوگ جمع ہو کر بدھو کے گھر کے پاس ایک کھلی جگہ میں ایک مکان تعمیر کر رہے تھے۔ موتی کے علاوہ دوسری بستیوں کے چھوٹے چھوٹے سردار بھی اس کام میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

---

(۵)

چند دنوں کے بعد سکھدیو نے کنول کے ساتھ اپنے نئے گھر میں قدم رکھتے ہوئے کہا "کنول! ہمارے گردش کے دن ختم ہوئے۔ آج سے ہماری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔" کنول نے اندر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بستی کے لوگوں نے ان کے لیے صرف مکان ہی تعمیر نہیں کیا بلکہ اس میں کھانے پینے کی اشیاء کا بھی اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو کئی مہینوں کے لیے کافی تھا۔

گاؤں کی عورتوں میں اس بات کا بہت چرچا تھا کہ کنول ایک بڑے سردار کی لڑکی ہے اور اس کا شوہر ایک بہت بڑے راجہ کی فوجوں کا افسر تھا وہ کنول کے پاس بیٹھنے، اس سے باتیں کرنے اور اس کی خدمت کرنے میں ایک مسرت محسوس کرتی تھیں۔ انہیں جب موقع ملتا۔ کنول کے گھر بھاگ آتیں۔ کوئی اس کے لیے آگ جلاتی، کوئی جھاڑو دیتی وہ انہیں منع کرتی۔ لیکن وہ اصرار کر کے اسے آرام سے بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتیں۔

قریباً یہی سلوک گاؤں کے مرد سکھدیو کے ساتھ کرتے تھے ماہی گیر اسے اپنے شکار اور چرواہے اسے اپنے دودھ اور مکھن کا سب سے پہلا حقدار سمجھتے تھے۔ وہ باہر جاتا تو چرواہوں اور ماہی گیروں کے کام میں ہاتھ بٹانا چاہتا لیکن وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے۔ مہاراج! یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کوئی کام کریں۔ آپ کی سیوا ہمارا فرض ہے۔"

سکھدیو بدھو کے پاس جاتا اور اصرار کرتا کہ "بھائی! آج تم آرام کرو میں بکریاں لے جاتا ہوں ورنہ میں تم سے دودھ نہیں لوں گا۔"

وہ مغموم ہو کر کہتا "بھائی! دیکھو یوں نہ کرو۔ تم یہ چاہتے ہو کہ میں بہن کنول

کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بہن بھائی مل گئے ہیں اور تم ہو کہ بار بار بیگانوں والی باتیں کرتے ہو۔"

موتی لاٹھی ٹیکتا ہوا دن میں ایک دو دفعہ سکھدیو کے گھر آتا اور ہمیشہ یہ پوچھتا "بیٹی کنول! اچھی ہو کوئی تکلیف تو نہیں؟" وہ جواب دیتی۔ "اچھی ہوں پتا جی!" وہ پیار سے کنول کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ اور کہتا "جیتی رہو بیٹیا! تم مجھے پتا جی کہتی ہو تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے بڑھاپے میں ایک سہارا مل گیا ہے۔"

سکھدیو کا خیال تھا کہ اس کے حال پر ان لوگوں کی توجہ آہستہ آہستہ کم ہو جائے گی اور اسے چند ہفتوں تک ان کی سخاوت کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے کے بجائے اپنی محنت اور مشقت سے روزی کمانے کا موقع مل جائیگا اور وہ بدھو کے ساتھ شامل ہو کر ایک جفاکش چرواہے کی زندگی بسر کر سکے گا لیکن لوگوں کی توجہ کم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔ اس بستی کے لوگوں کے علاوہ دوسری بستیوں کے باشندے اور ان کے سردار جب اپنے بڑے سردار سے ملنے کے لیے آتے۔ سکھدیو کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے آتے۔ اگر بھیا سکھدیو یہ چیزیں لینے سے انکار کر دیتا تو وہ بہن کنول کی منت سماجت کر کے منا لیتے۔ بعض اوقات ان کے گھر میں مکھن، مچھلی، شہد اور دیگر اشیاء اس قدر جمع ہو جاتیں کہ کنول کو پڑوسیوں میں تقسیم کرنا پڑتیں۔

سکھدیو کی خودداری نے اسے دیر تک خاموش رہنے کی اجازت نہ دی وہ ایک صبح بستر سے اٹھتے ہی سیدھا سردار کے پاس پہنچا۔ سردار بستر پر بیٹھا کھانس رہا تھا۔ سکھدیو کو دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ بیٹا آؤ! کل کالو کی بستی کے چند کسان کچھ مکی اور چاول لے کر آئے تھے۔ مکی میں نے چند عورتوں کو پیسنے کے لیے دے دی ہے کل تک تمہارے گھر آٹا پہنچ جائے گا۔ چاول ابھی بھیج دیتا ہوں۔"

سکھدیو نے کہا "اگر آپ اسی طرح کرتے رہیں گے تو مجھے کوئی اور جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

سردار نے چونک کر سکھدیو کی طرف دیکھا اور کہا "نا بیٹا! یوں نہ کہو۔ اگر مجھے تمہارا سہارا بھی نہ رہا تو بڑھاپے کے دن گزارنے مشکل ہو جائیں گے تمہیں دیکھتا ہوں تو مردہ رگوں میں جان آجاتی ہے بلاوجہ ناراض ہونا تو ٹھیک نہیں!"

سکھدیو نے ذرا نادم ہو کر کہا "میں آپ سے ناراض نہیں ہوں لیکن مجھے ان لوگوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنا پیٹ بھرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ میں نے آپ سے کئی بار عرض کیا ہے کہ میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتا ہوں۔ میرے ہاتھ کافی مضبوط ہیں اور میں سخت سے سخت کام کر سکتا ہوں۔"

"کیا کام کرنا چاہتے ہو بیٹا؟"

سکھدیو نے کہا "آپ کی بکریاں جو دوسرے چرواہے چراتے ہیں۔ ان میں سے کچھ میں چرالایا کروں گا۔ جو حصہ آپ انہیں دیتے ہیں وہ مجھے دے دیا کریں۔"

"بیٹا! یہ کام تمہاری شان کے شایاں نہیں۔"

"یہ بھی میری شان کے شایاں نہیں کہ میں دوسروں سے لے کر کھاؤں!"

"اچھا تو میری ایک بات مانو گے؟"

"بتائیے!"

"سنو! تم میرے بیٹے ہو اور کنول میری بہو ہے۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ میری زندگی میں بھی تمہارا ہے اور میرے بعد بھی تمہارا ہوگا۔ اگر تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتے تو جتنی بکریاں سنبھال سکو لے لینا۔ تمہیں ایک نوکر بھی مل جائے گا۔"

سکھدیو نے کہا "مجھے نوکر کی ضرورت نہیں۔ میں بدھو کے ساتھ جایا کروں گا اور ہم دونوں بڑے سے بڑا گلہ سنبھال سکتے ہیں۔"

"اچھا بیٹا! آج تو آرام کرو۔ شام کو چرواہے آئیں تو بدھو کو ساتھ لے کر آجانا۔"

اگلے دن ایک کھلی چراگاہ میں بدھو کی بکریوں کے ساتھ سکھدیو کی پچاس بکریاں اور چالیس بھیڑیں بھی چر رہی تھیں۔ سکھدیو ایک درخت کے نیچے لیٹا بدھو کی بنسری کی دل کش تانیں سن رہا تھا۔

راجہ اور پروہت

سکھدیو کے قید سے فرار ہونے اور گنگارام کی موت کے بعد حالات نے راجہ کو باغیوں کے متعلق اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلایا۔

گنگارام راجہ کو اپنی پہلی شاندار فتح کی خوش خبری سنانے اور آگے بڑھنے کے لیے مزید فوجوں کا مطالبہ کرنے اور سب سے زیادہ سکھدیو کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی نیت سے فوج کی قیادت اپنے بھائی جے رام کو سونپنے کے بعد واپس لوٹا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے جے رام کو ایک محدود علاقہ میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

جے رام اپنے بھائی کی غیر حاضری میں بیس پچیس میل کے رقبے میں شکست خوردہ اور نہتے انسانوں کے سینوں پر اپنی تلوار کی تیزی آزماتا رہا۔ وہ لوگ جن کی ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھا سکتی تھیں اپنے سردار کی بستی پر طاقتور دشمن کے حملے کی خبر سنتے ہی بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لے چکے تھے۔ تاہم حملہ آوروں نے اپنے تیز رفتار گھوڑوں کی مدد سے بوڑھوں اور بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کے لیے فرار کی تمام راہیں بند کر دیں اور جے رام نے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے میں مقدس دیوتاؤں کی خواہشات کا پورا پورا لحاظ رکھا۔

قدرت نے گنگارام کو اپنے پرانے حریف سکھدیو پر آخری فتح حاصل کرنے کے بعد لوٹ کر ان پہاڑیوں کی آخری چوٹیوں پر اونچی ذات والوں کی فتوحات

کے جھنڈے لہرانے کی اجازت نہ دی اور وہ سکھدیو کے تیروں کا نشانہ ہو کر چل بسا۔

گنگارام کی موت کے بعد راجہ، رام داس کو سپہ سالار کے منصب پر فائز کرنا چاہتا تھا لیکن پروہت نے جو گنگارام کی طرح سکھدیو کے ہر دوست کا مخالف تھا۔ جے رام کی سفارش کی۔ راجہ کی نگاہ میں جے رام بہادر تھا نہ ہوشیار۔ لیکن اس کی تازہ کامیابیوں کے متعلق جو خبریں موصول ہو رہی تھیں ان کی بدولت برہمنوں کے علاوہ بعض کھشتری سردار بھی جے رام کے طرفدار ہو گئے تھے۔

راجہ نے مجبوراً اسے سپہ سالار کا عہدہ دے کر دو ہزار سپاہیوں کی کمک بھیج دی اور پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا۔

جے رام نے حریف کی سراسیمگی اور انتشار سے فائدہ اٹھایا اور چند دنوں میں اس کی فوج کسی قابلِ ذکر مزاحمت کا سامنا کیے بغیر ایک وسیع علاقے پر قابض ہو گئی لیکن اونچے پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں پر اس کی پیش قدمی کی رفتار نسبتاً سست تھی اور پہاڑی قبائل کو اپنی بستیاں خالی کر کے محفوظ مقامات پر پہنچنے کا موقع مل گیا۔

حملہ آوروں کی دہشت نے ان لوگوں کے قویٰ مفلوج کر دیے تھے وہ کچھ عرصے تک انفرادی طور پر صرف اپنی جانیں بچانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور ان کے دل میں انتقام کی دبی ہوئی آگ بے بسی کے آنسوؤں میں تبدیل ہوتی رہی۔

قریباً دو ماہ کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس قوم کے نوجوانوں میں جن کا خون خوف اور دہشت سے منجمد ہو چکا تھا ایک نئی حرارت پیدا کر دی۔ جے رام کی فوج کے ایک سالار نے ایک وادی میں ایک گاؤں پر حملہ کیا

گاؤں کے لوگ حملہ آوروں کی آمد سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔ سپاہیوں نے تمام جھونپڑوں کو آگ لگا دی۔ گاؤں کے باشندے اونچی پہاڑی پر کھڑے اپنے جلتے ہوئے گھروں کو دیکھ رہے تھے اور ان میں سے بعض اس پہاڑ کو دشمن کے گھوڑوں کی رسائی سے محفوظ پا کر سپاہیوں کو برا بھلا بھی کہہ رہے تھے۔ راجہ کے سپاہیوں کے لیے دشمن کی یہ جرأت ایک نئی بات تھی۔ ان کے سالار نے انہیں گھوڑوں سے اتر کر ان لوگوں کے تعاقب کا حکم دیا۔

جب پیدل سپاہی پہاڑی پر چڑھنے لگے تو یہ لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلے لیکن ایک نوجوان کو غیرت آئی اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ جب سپاہی ایک خطرناک ڈھلوان پر پہنچ گئے تو اس نے پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ آن کی آن میں پندرہ بیس سپاہی چت ہو کر نیچے لڑھک گئے اور ان کے دوسرے سالار نے بلندی کا رُخ کرنے کی بجائے نیچے اترنا بہتر خیال کیا۔

دوسرے لوگوں نے دور سے یہ منظر دیکھا تو بجلی کی تیزی کے ساتھ آس پاس کی تمام پہاڑیوں پہ چھا گئے اور اس تنگ وادی کی ہر ڈھلوان سے پتھر لڑھکنے لگے۔

سپاہی دشمن کے اس غیر متوقع حملے سے بدحواس ہو کر اپنی اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگے لیکن باغی اس تنگ وادی سے نکلنے کے تمام راستوں پر قابض ہو چکے تھے۔

رات کے وقت جب جے رام اپنی فوج کے تمام افسروں کی کارروائی سُن رہا تھا تو اسے ان سو بہادروں میں سے صرف چار کے زخمی ہو کر واپس ہونے کی اطلاع ملی۔

---

(۲)

تلواروں کے مقابلے میں پتھروں کی پہلی شاندار فتح نے ان لوگوں پر ایک جادو کا سا اثر کیا اور وہ یکے بعد دیگرے اس نوجوان کے گرد جمع ہونے لگے انہوں نے نشیب کے قابلِ گزر علاقوں کی باقی تمام بستیاں بھی خالی کر دیں اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان ایک وادی کو اپنا مرکز بنا لیا۔ چند نوجوان اس وادی سے نکل کر دُور دُور تک چکر لگاتے اور اگر اپنی قوم کا کوئی گروہ نظر آتا تو اسے اس وادی میں لے آتے۔

جے رام طاقت کے نشے میں چُور تھا اس نے چند سپاہیوں کے نقصان کو کوئی اہمیت نہ دی اور بلا تامل اپنے پورے لشکر کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی۔

کئی اُجڑی ہوئی بستیوں کو جلانے کے بعد ایک دن جے رام کی فوج ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہی تھی کہ اوپر سے اچانک پتھر برسنے لگے۔ جے رام نے بدحواسی کی حالت میں پہاڑی کی چوٹی پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن وہ مقام جسے وہ ناواقفیت کی بنا پر پہاڑی کی چوٹی سمجھتا تھا ایک اونچے پہاڑ کی ڈھلوان تھی۔ وہ ایک تہائی فوج کی قربانی کے بعد اس مقام تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی پہ جہاں سے پتھر آ رہے ہیں قبضہ کرنے کے لیے اسے دوگنا اور اوپر جانا پڑے گا۔

پتھروں کی بارش اچانک تھم گئی اور جے رام نے سمجھا کہ دشمن کو اس کی ہمت نے مرعوب کر دیا ہے چنانچہ اس نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا لیکن اس کے سپاہی مشکل سے کوئی سو گز اوپر چڑھے تھے کہ دشمن زیادہ جوش و خروش سے پتھر پھینکنے لگے۔ بلند پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتا ہوا ایک پتھر کئی چھوٹے چھوٹے پتھر اپنے ساتھ لے آتا اور ایک سپاہی گرتے وقت اپنے ایک دو اور ساتھیوں

کو بھی نیچے لے جاتا۔

فوج کی افراتفری نے جے رام کے حواس مختل کر دیے اور اس نے سپاہیوں کو نیچے اترنے کا حکم دے دیا اس وقت تک جے رام کی قریباً آدھی فوج تباہ ہو چکی تھی۔ ایک پتھر جے رام کے سر پر لگا اور وہ تین اور سپاہیوں کو اپنے ساتھ لیے لڑھکتا ہوا ایک کھڈ میں جا گرا۔

سیناپتی کی موت سے سپاہیوں کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے کسی کو پتھر لگا، کسی کا پاؤں پھسلا اور کسی کو اپنے ساتھی کا دھکا لگا۔ غرض سیناپتی کے علاوہ ڈیڑھ ہزار سپاہی موت کی نیند سو گئے۔

چار یوم کے بعد دھرم پور کے ہر گھر سے رونے اور پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

---

(۱۱)

راجہ گزشتہ چند مہینوں میں جے رام کی کامیابیوں کے متعلق نہایت حوصلہ افزا خبریں سن چکا تھا اور پروہت کئی بار اسے جتا چکا تھا کہ جے رام کو سیناپتی بنانے میں دیوتاؤں کی مرضی شامل تھی۔ وہ ہر نئی خوش خبری کے بعد راجہ کے سامنے اپنے یہ الفاظ دہراتا۔ "مہاراج! اگر آپ رام داس کو اس مہم پر بھیجتے تو اتنی شاندار کامیابیاں حاصل نہ ہوتیں۔"

راجہ نے تازہ شکست اور تباہی کا حال سن کر اپنے تمام درباریوں کی طرف جو اپنے کسی نہ کسی عزیز کی موت پر آنسو بہا رہے تھے، دیکھا اور اس شکست کی تمام ذمہ داری بدنصیب پروہت کے سر تھوپ دی۔ اس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "کہیے پروہت جی! اب دیوتاؤں کی کیا مرضی ہے؟ جس راجہ کے سر پر آپ

جیسا پروہت ہو اسے تخت و تاج چھوڑ کر کسی جنگل میں چلے جانا چاہیے۔ آپ نے ہمیشہ ایسی جگہ اپنی ٹانگ اڑائی جہاں دخل دینے کا آپ کو کوئی حق نہ تھا کہیے اب ان لوگوں کو کیا جواب دوں؟"

پروہت نے نادم سا ہو کر جواب دیا "مہاراج! بھگوان کی یہی مرضی تھی۔"

راجہ نے برہم ہو کر کہا "خوب! بھگوان کی یہی مرضی تھی کہ اس کے دھرم کی رکھشا کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی قیادت ایک گدھے کے سپرد کر دی جائے کیا بھگوان کی مرضی یہی تھی۔ کہ ہماری رعایا سے ہزاروں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہو جائیں۔ نہیں یہ بھگوان کی مرضی نہ تھی۔ ان سب کا پاپ تمہارے سر ہے۔"

پروہت نے ملتجی نگاہوں سے سرداروں کی طرف دیکھا۔ ایک سردار نے کہا "مہاراج! اب آپس میں جھگڑنے کا وقت نہیں۔ دشمن سے انتقام لینے کا وقت ہے۔"

راجہ نے جھنجھلا کر جواب دیا "کیسا انتقام؟ آج تم اپنے عزیزوں اور دوستوں کی تباہی کا حال سنتے ہو تو تمہارے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اپنی قوم کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا کب تک خاموش رہ سکتے تھے؟ کاش! تم سکھدیو کے مشورہ پر عمل کرتے اور ان لوگوں کو خواہ مخواہ دشمن بنانے کی بجائے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے لیکن تم لوگ دشمن کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے اور دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جو موقع آنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیتا۔ جب موقع تمہارے ہاتھ آیا تو تم نے ان پر ہر طرح ظلم روا رکھا اور جب انہیں موقع ملا وہ تم پر رحم کیوں کرتے؟ وہ ایک مرتبہ رحم کر کے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے سکھدیو کو ڈوبنے سے بچایا، تم نے اس کا کیا صلہ دیا۔ سکھدیو کی رگوں میں ایک کھشتری کا خون تھا وہ دشمن کے احسان کا بدلہ ظلم سے کیسے دے

سکتا تھا۔ لیکن تم نے اور تمہارے پروہت نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس پر طرح طرح کے الزام تراشے گئے۔ اس کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی۔ یہ بھی دیوتاؤں کی کرپا تھی کہ وہ جان بچا کر بھاگ گیا۔ لیکن تم میں سے کون ہے جو اس کی جگہ لے سکتا ہے کیا وہ احمق جس نے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے شوق میں ڈیڑھ ہزار نوجوان ہلاک کروا دیئے اس قابل تھا کہ اسے سیناپتی بنایا جاتا؟"

سردار کو راجہ کی گرجتی ہوئی آواز نے خاموش کر دیا۔ لیکن پروہت کے لیے یہ باتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس نے کہا:

"مہاراج! میں جانتا ہوں کہ اس خبر نے آپ کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ لیکن آپ نہیں جانتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں سکھدیو کا دشمن نہ تھا لیکن دھرم کی حفاظت میرا فرض تھا۔ دھرم کسی کو نیچ ذات دشمن کے ساتھ اس قدر گھل مل جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ دھرم ایک کھشتری کو نیچ ذات لڑکی کے ساتھ پریم کی اجازت نہیں دیتا۔ سکھدیو نے دھرم کی توہین کی اور دھرم کا محافظ ہونے کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ اس کی سزا تجویز کروں۔ اگر وہ میرا بیٹا بھی ہوتا تو بھی میں اس کے لیے بھگوان کو ناراض نہ کرتا۔"

راجہ نے کہا: "اگر اس کی سزا سے بھگوان خوش ہوتا تو وہ یقیناً جان بچا کر نہ بھاگ جاتا۔"

پروہت نے کہا "مہاراج ہو سکتا ہے کہ بھگوان نے اسے کسی زیادہ بڑی سزا کے لیے زندہ رکھا ہو۔"

راجہ نے جھنجھلا کر کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھگوان بھی کوئی تمہارے جیسا ہے جو نہ بھولتا ہے اور نہ معاف کرتا ہے۔"

پروہت اس بات کا جواب سوچ رہا تھا کہ رام داس دربار میں داخل ہوا

اور اس کی پریشان صورت نے تمام حاضرینِ دربار کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

رام داس نے کہا "مہاراج! محل کے باہر بہت لوگ جمع ہو رہے ہیں آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل کر انہیں تسلی دیں۔"

راجہ نے جواب دیا "پروہت جی کو لے جاؤ۔ میں اپنی پرجا کو منہ نہیں دکھا سکتا۔"

ایک بوڑھے سردار نے کہا "مہاراج! جو ہوا سو ہوا آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ آپ ہمت کیجئے۔ دشمن سے بدلہ لینے کے لیے ہماری تلواریں حاضر ہیں۔ بہادر بدنامی کے داغ آنسوؤں سے نہیں۔ خون سے دھوتے ہیں۔"

راجہ نے تلخ ہو کر کہا "پھر وہی بات۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بدلہ کیسے لے سکتے ہو؟"

سردار نے کہا "مہاراج! ہمارے پاس اب بھی دو ہزار سپاہی موجود ہیں۔ اور اگر ہم کوشش کریں تو اتنے اور جمع کر سکتے ہیں۔ ہماری شکست کی وجہ صرف یہ تھی کہ دشمن نے دشوار گزار پہاڑیوں سے فائدہ اٹھایا ورنہ میدان میں ہمارا ایک سپاہی ان سب کو بھیڑوں کی طرح ہانک سکتا ہے۔"

راجہ نے جواب دیا "بہت اچھا۔ تم پروہت جی کو ساتھ لے جاؤ اور دشمن سے التجا کرو کہ وہ پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان میں آ جائے کیونکہ ہم اس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں اگر وہ تمہاری بات مان لے تو میری باقی فوج حاضر ہے ورنہ ان پہاڑوں سے کہو کہ تمہارے راستے سے ہٹ جائیں۔"

سردار نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "مہاراج! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ پروہت کی وجہ سے ہوا تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں۔ کہ وہ آئندہ ایسے معاملات میں دخل نہ دیں گے۔"

راجہ نے ذرا نرم ہو کر جواب دیا۔ "تمہیں یہ کہنے سے پہلے پروہت جی سے مشورہ کر لینا چاہیئے تھا مجھے ڈر ہے کہ یہ اپنی عادت تبدیل نہیں کریں گے"

بدنصیب پروہت کو اپنی جان چھڑانے کی تدبیر نظر آئی اس نے کہا:۔

"مہاراج! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کی کسی بات میں دخل نہ دوں گا۔"

راجہ کے لیے یہ ایک بہت بڑی فتح تھی۔ تخت نشینی سے لے کر اب تک اسے یہ تلخ احساس کھائے جا رہا تھا کہ حکومت کا صحیح اقتدار اس بڑی مونچھوں والے برہمن کے ہاتھ میں ہے اور اس کی حیثیت پروہت کے ہاتھوں میں ناچنے والی ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں اور اس کی ہر خواہش اور ہر ارادہ پروہت کی رضامندی کا محتاج ہے۔ پروہت کے اعترافِ شکست سے اس کے غصے کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"شاید تم سمجھتے ہو کہ شکست نے مجھے بزدل بنا دیا ہے۔ نہیں میں دشمن پر فتح حاصل کروں گا۔ لیکن یہ فتح ایسی نہ ہو گی کہ دشمن چار ماہ کے بعد پھر سر اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ میں ایک ایسی فتح حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ دشمن صدیوں تک سر نہ اٹھا سکے۔ یاد رکھو! ہم تلواروں اور نیزوں کے بل بوتے پر دشمن کو ایک عرصہ کے لیے مغلوب رکھ سکتے ہیں لیکن اس پر دائمی غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری ریاست میں ہزاروں اچھوت آباد ہیں۔ یہ لوگ بھی کسی زمانے میں ہمارے دشمنوں کی طرح آزاد تھے۔ اگر ہمارے باپ دادا بھی ایسے پروہتوں کی مرضی پر چل کر ان پر خواہ مخواہ ظلم کرتے تو یہ لوگ آج ہمارے پُرامن غلام نہ ہوتے۔ اگر ان کی جھونپڑیاں جلائی جاتیں یا ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جاتا تو یہ بھی کہیں پناہ لے کر ہم سے انتقام لینے کی کوشش کرتے لیکن ہمارے بزرگوں نے ان لوگوں پر فتح حاصل کرنے کے

بعد ان پر ظلم کرنے کی بجائے انہیں اپنی پناہ میں رکھا۔ ان کو اپنے شہروں کے پاس بستیاں تعمیر کرنے کی اجازت دی اور یہ ان کے اسی سلوک کا نتیجہ ہے کہ آج یہ لوگ ہمیں اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے ہماری غلامی میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ہمیں اب یہ حق دیتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔ ہم انہیں کتوں کی طرح ذلیل سمجھتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا احساس تک نہیں رہا۔ بار بار نشتر چبھو کر شاید انہیں ہم اپنے جیتے جاگتے دشمن بنا لیتے لیکن ہمارے بزرگوں کی تھپکیوں نے انہیں موت کی نیند سلا دیا ہے۔ میں اپنے نئے دشمن پر بھی اسی قسم کی فتح حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر پروہت جی کچھ عرصہ خاموش بیٹھے رہے تو مجھے یقین ہے کہ اپنے اس مقصد میں کامیابی ہو گی۔"

راجہ کی مؤثر تقریر نے سب کو مسحور کر دیا اور تمام سردار یک زبان ہو کر اس کے تدبّر کی تعریف کرنے لگے۔

بوڑھے سردار نے کہا: "مہاراج! اگر آپ کا یہ ارادہ ہے تو آپ جو جی میں آئے کیجیئے ہم آپ کی باتوں میں کسی کا دخل برداشت نہیں کریں گے۔"

پروہت دربار سے اپنے اقتدار کا جنازہ نکلتا دیکھ رہا تھا لیکن اس میں لب ہلانے کی جرأت نہ تھی۔

راجہ نے سرداروں کی طرف سے مطمئن ہو کر پروہت کی طرف دیکھا اور کہا "پروہت جی! مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی میرے خیالات سے اتفاق ہو گا۔"

پروہت نے جواب دیا۔ "بھگوان آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ دھرم کی سیوا کریں اور میں آپ سے اختلاف رکھوں!"

راجہ نے رام داس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بہت اچھا رام داس! آج سے

تم میری فوج کے سیناپتی ہو تمہیں آج ہی دریا عبور کرنا ہوگا۔ شہر میں جس قدر فوج ہے لے جاؤ دشمن پہاڑوں سے نیچے اتر کر مقابلہ نہیں کرے گا۔ تم بھی فی الحال آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ دور کے اونچے پہاڑوں پر برف باری شروع ہو گئی تو دشمن خود بخود مجبور ہو کر نیچے اترے گا۔ لیکن تمہارا کام اسے نشتر چبھو کر بیدار کرنا نہیں۔ تھپکیاں دے کر سلانا ہے۔ میں تمہیں بہت بڑی ذمہ داری سونپ رہا ہوں۔"

رام داس نے راجہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا "مہاراج! مجھے معلوم ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جب دربار برخاست ہوا تو راجہ نے رام داس کو وہاں ٹھہرالیا اور کہا:

"ایک بات کا خاص خیال رکھنا اور وہ یہ ہے کہ کسی پروہت کو اپنے سر پر نہ چڑھا لینا۔ برہمنوں نے وہاں ابھی سے کالی دیوی کے مندر کی تعمیر شروع کر دی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کے کسی آدمی کا بلیدان ساری قوم کو پھر ایک بار ہمارے خلاف مشتعل کر دے۔ میں سیناپتی کے عہدہ کے علاوہ اس علاقے کی سرداری بھی تمہیں سونپتا ہوں۔"

نیا سردار

وقت گزرتا گیا۔ سکھدیو کو ان لوگوں کے درمیان ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ دنیا کی ہر وہ نعمت جس کی اس سادہ اور معصوم ماحول میں تمنا کی جا سکتی تھی قدرت نے اسے عطا کر رکھی تھی۔ سماج کے خلاف نفرت اور حقارت کا جو طوفان وہ اپنے دل میں لے کر آیا تھا آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے دل میں وہ امنگیں، وہ ارادے اور وہ ولولے جو ایک زبردست اور انصاف پسند طاقت کے تخیل نے پیدا کیے تھے زندگی کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں میں دب کر رہ گئے۔

سکھدیو کے دماغ سے مساواتِ انسانی کے اصول پر ایک نئی دنیا بسانے کا خیال مٹ چکا تھا اور اس کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں ایک کم سن لڑکے اور ایک ننھی لڑکی تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ سکھدیو نے لڑکے کا نام مادھو اور لڑکی کا نام شانتا تجویز کیا تھا۔

کنول مادھو کو اٹھا کر بار بار سینے سے لگاتی اور سکھدیو سے کہتی "دیکھیے! اس کی شکل بالکل آپ سے ملتی ہے۔"

سکھدیو، شانتا کو گود میں لے کر بیٹھ جاتا اور اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہتا۔ "دیکھو کنول! اس کی ناک اس کی آنکھیں، اس کی پیشانی اور اس کے ہونٹ بالکل تمہاری طرح ہیں۔"

بدھو گھر آتا تو مادھو بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ شانتا جو

اس سے دو سال چھوٹی تھی اور ابھی چل پھر بھی نہ سکتی تھی۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے "چا۔۔۔۔ چا" کہہ کر ہاتھ پھیلا دیتی۔ وہ ان دونوں کو اٹھا کر چارپائی پر بیٹھ جاتا انہیں خوش کرنے کے لیے بنسری بجاتا اور ہنسانے کے لیے بکری، گیدڑ اور بھیڑیوں کی بولیاں بولتا۔ اور وہ جواب میں اس کے کان پکڑ کر کھینچتے اور بال نوچتے کنول ہر بار کہتی "بھیا بدھو! تم انہیں شریر بنا دو گے" اور وہ ہر بار ہنس کر یہ جواب دیتا۔ "بہن کنول! بچے شریر ہی اچھے ہوتے ہیں۔ میں خود بھی اس عمر میں بڑا شریر تھا۔"

موتی آتا اور مادھو کو اپنے گھر لے جاتا اور جب مادھو اس کے گھر میں کھیل کود سے اکتا جاتا تو خود ہی آ کر چھوڑ جاتا۔

آٹھ سال کی عمر میں مادھو ایک گدھے پر سوار ہو کر سکھدیو اور بدھو کے ساتھ باہر چلا جاتا اور شام تک ان کے ساتھ چراگاہوں میں گھومتا پھرتا۔

بدھو اسے جھیل میں تیرنے، درختوں پر چڑھنے اور بانسری بجانے کی تعلیم دیا کرتا تھا اور سکھدیو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کمان دے کر اسے تیراندازی سکھایا کرتا۔ شانتا اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ جھیل کے کنارے جھولا جھولا کرتی تھی۔

---

(۲)

موتی بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اکثر بیمار رہتا۔ بیماری کی حالت میں جہاں تک اس سے ہو سکا سرداری کے فرائض پورے کرتا رہا اور جب طاقت جواب دینے لگی تو بہت سے معاملات میں سکھدیو سے مدد لینے لگا۔

تمام بستیوں کے چرواہوں نے اپنی اپنی حدود مقرر کر رکھی تھیں، اور ماہی گیروں نے بھی شکار کے لیے جھیل کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کھیتی باڑی کرنے والے ان لوگوں میں بہت کم تھے اور ان کے آپس میں جھگڑے بھی کم ہوتے تھے لیکن چرواہوں اور ماہی گیروں کے درمیان کبھی نہ کبھی چراگاہوں اور شکارگاہوں کی تقسیم پر جھگڑا ہو جاتا اور تمام سردار اپنی اپنی بستی کے لوگوں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس قسم کے تمام مقدمات میں موتی کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا۔ جب کام کرنے کی ہمت نہ ہوتی تو وہ ایسے معاملات سکھدیو کے سپرد کر دیتا۔

سکھدیو کی انصاف پسندی اور معاملہ فہمی عوام کو اس کا گرویدہ بنا چکی تھی لیکن دوسری بستیوں کے بعض سردار جو موتی کے بعد بڑا سردار بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ سکھدیو کے خلاف اپنے دلوں میں حسد اور بغض کے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ ان سرداروں میں سے راموا اثر و رسوخ کے لحاظ سے موتی سے دوسرے درجے پر تھا اور وہ اپنی زندگی کے ایک بلند مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں کا سردار بننے کے لیے بے قرار تھا اور نہایت بے تابی سے موتی کی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ دوسرے سردار اس کے مقابلے میں سر نہیں اٹھائیں گے لیکن سکھدیو کی طرف سے اسے اطمینان نہ تھا۔

سکھدیو کے دل میں موتی کا جانشین بننے کا خیال تک نہ تھا وہ محض موتی کی مجبوری کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

زندگی کے آخری ہفتوں میں موتی کی بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے لیے کسی سہارے کے بغیر بستر سے اٹھ کر بیٹھنا بھی محال تھا۔ لوگ جوق در جوق اس کی عیادت کے لیے آتے۔ کنول اور سکھدیو کو ہر وقت اس کے قریب دیکھ

کران میں سے اکثر ان کی عملی ہمدردی کے قائل ہوتے لیکن چند لوگ، جو رامو کے ہم خیال تھے اسے صرف ظاہرداری سمجھتے۔

سکھدیو، رامو کے متعلق یہ سن چکا تھا کہ اس کا باپ موتی سے پہلے ان لوگوں کا بڑا سردار تھا۔ باپ کی موت کے بعد لوگوں نے رامو کو اپنا سردار بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جس روز یہ فیصلہ ہوا اس سے اگلی رات رامو نے ایک چرواہے کی بیوی کی عصمت پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور اس کی چیخ پکار سے بستی کے لوگ جمع ہو گئے۔ اگلے روز سرداروں کی پنچایت نے اسے دس سال کے لیے جلاوطن کر دیا اور موتی کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ رامو نے جلاوطنی کے دس سال کہاں گزارے؟ یہ کسی کو علم نہ تھا لیکن دس سال کے بعد وہ جب واپس لوٹا۔ یہ لوگ پرانی رنجش بھول گئے۔ موتی نے بھی اس کا قصور معاف کر دیا اور ایک چھوٹی سی بستی کے سردار کی موت کے بعد اسے سردار بنا دیا۔

رامو جب کبھی سکھدیو سے ملتا۔ دیویوں اور دیوتاؤں کے قصے لے بیٹھتا سکھدیو اس کی باتوں سے یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنی جلاوطنی کے زمانے کا کچھ حصہ اونچی ذات والوں کے کسی شہر کے قریب گزار چکا ہے۔ رامو سماج کے بڑے بڑے دیوتاؤں کے نام جانتا تھا اور ان کا احترام بھی کرتا تھا۔ ان لوگوں میں رامو ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے سکھدیو کی داستان نہایت انہماک کے ساتھ سنی اور اختتام پر سکھدیو کے خیالات کی عظمت کا اعتراف کرنے کی بجائے اس کی بدنصیبی پر افسوس ظاہر کیا اور کہا "سکھدیو! افسوس تم آسمان کی بلندی سے زمین کی پستی پر آ گرے ہو... تم بدنصیب ہو"

آس پاس کی بستیوں میں رامو کی بہت شہرت تھی۔ وہ عجیب و غریب کہانیاں سنا کر سادہ دل چرواہوں کو اپنا گرویدہ بنا چکا تھا۔ یہ لوگ ہر عجیب شے

کی طرف متوجہ ہونے کے عادی تھے لیکن سکھدیو کی آمد کے بعد رامو یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ شام کے وقت عورتوں اور مردوں کی مجلس میں اپنی کہانیوں کی بجائے سکھدیو اور کنول کے متعلق نئے نئے افسانے سن کر اس کے دل میں حسد اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی۔ موتی اگرچہ بیماری اور بڑھاپے سے لاغر ہو چکا تھا تاہم اس کے ساتھ لوگوں کی عقیدت میں فرق نہیں آیا تھا اس لیے سردار کو ہر بات میں سکھدیو کی حمایت کرتے دیکھ کر رامو کو سکھدیو کے ساتھ کھلی دشمنی کی جرأت نہ ہوتی تاہم اسے اطمینان تھا کہ سردار کی موت کے بعد اسے اپنے راستے سے یہ پتھر ہٹانے میں دقت پیش نہیں آئے گی کئی ہفتے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد بوڑھا سردار ایک شام چل بسا۔

---

(۳)

صبح ہوتے ہی تمام بستیوں کے لوگ اپنے اپنے سرداروں سمیت موتی کی موت پر اظہارِ افسوس اور نئے سردار کے انتخاب کے لیے پیپل کے درختوں کے درمیان ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر مرنے والے کی خوبیاں بیان ہوئیں اور اس کے بعد نئے سردار کے انتخاب کے متعلق بحث چھڑ گئی۔ چند سرداروں نے یک زبان ہو کر رامو اور چند نے سکھدیو کا نام پیش کیا۔ رامو کے طرف دار یہ کہتے تھے کہ وہ ہماری قوم کا آدمی ہے۔ اس کے باپ دادا سردار تھے اس لیے اس کا حق کسی غیر کو نہیں دیا جا سکتا۔ سکھدیو کے طرف دار یہ کہتے تھے کہ جو خوبیاں اس میں ہیں وہ رامو میں نہیں۔ وہ بڑے راجہ کی فوجوں کا سردار رہ چکا ہے وہ

حکومت کرنا جانتا ہے اس کو سردار بنا کر ہم بہت سکھ پائیں گے۔"

آہستہ آہستہ یہ بحث سرداروں کی مجلس سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی۔

سرداروں میں سب سے زیادہ رامو اور عوام میں سب سے زیادہ بدھو کی آواز بلند تھی۔ بدھو صرف اتنا جانتا تھا کہ سکھدیو کے سوا اور کوئی شخص سردار ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ سرداروں کا جرگہ اس کے لیے بے معنی تھا۔ ادھر سرداروں میں سے کسی نے سکھدیو کا نام لیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "ہمارا سردار سکھدیو ہے۔ سکھدیو! سکھدیو!!"

سکھدیو کے طرف دار اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور چاروں طرف سے سکھدیو کے حق میں نعرے بلند ہونے لگے۔

رامو کے حامیوں نے بھی زبان کی تلواریں بے نیام کیں۔ لیکن وہ تعداد میں کم تھے اور ان کی آواز بدھو کا ساتھ دینے والوں کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔ رامو نے اٹھ کر ان سے سرداروں کے فیصلے تک خاموش رہنے کی درخواست کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ رامو نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور اونچی آواز میں کہا:

"بھائیو! ہم جانتے ہیں کہ تم سکھدیو کو اپنا سردار بنانا چاہتے ہو لیکن میری بات سنو۔ میرے خیال میں سکھدیو ایک اچھا آدمی ہے لیکن وہ ہماری قوم کا نہیں ہم اس بات کا فیصلہ کر رہے ہیں کہ ایک غیر قوم کا آدمی ہمارا سردار ہو سکتا ہے یا نہیں جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوتا تم صبر کرو۔ تم یہ اطمینان رکھو کہ ہم سب سکھدیو کی عزت کرتے ہیں لیکن اگر سرداروں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ دوسری قوم کا آدمی ہمارا سردار نہیں ہو سکتا تو تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

لوگ بیٹھ گئے اور سرداروں کی بحث شروع ہو گئی۔ عوام کی طرح سرداروں کی اکثریت بھی سکھدیو کے حق میں تھی جب رامو کے ساتھی چاروں طرف سے مایوس

ہو کر گالی گلوچ پر اتر آئے تو سکھدیو کے حامیوں نے اس کے جواب میں لاٹھیاں اٹھا لیں۔ یہ حالت دیکھ کر سکھدیو جو ابھی تک ایک طرف کھڑا تھا لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور چبوترے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بھائیو! اس نے بلند آواز میں کہا "مجھے ڈر ہے کہ تم اس شخص کے لیے لڑ رہے ہو جسے تمہارا سردار بننے کا خیال تک نہیں۔ میں تمہارے پاس ایک بے یار و مددگار مسافر کی حیثیت میں آیا تھا تم نے مجھے رہنے کو گھر دیا۔ کھانے پینے کی تمام چیزیں دیں تم نے ہمیشہ مجھے اپنا بھائی سمجھا لیکن میں یہ نہیں بھولا کہ میں اس بستی میں ایک غریب مسافر ہوں۔ میرے بھائی رامو اور کئی اور دوستوں کا یہ خیال ہے کہ مجھے تم لوگوں کا سردار بننے کی ہوس ہے لیکن یہ ان کی بھول ہے میں پہلے بھی تمہارا خادم تھا اور اب بھی۔ مجھ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میرے لیے آپس میں لڑو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنی قوم میں سے کسی کو سردار بنا لو۔ میں ایک مسافر ہوں اور ضروری نہیں کہ تمام عمر اسی جگہ گزاروں۔"

سکھدیو کی تقریر کا آخری فقرہ سن کر بعض لوگوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

ایک بوڑھے سردار نے اٹھ کر کہا "ہم آپ کو کبھی نہیں جانے دیں گے اگر آپ ہمارا سردار بننے سے انکار کرتے ہیں تو اپنی مرضی سے کسی اور کو سردار بنا دیں۔ ہم سب اس کا حکم مانیں گے۔"

اکثر سرداروں نے اس بات کی تائید کی۔ سکھدیو نے یکے بعد دیگرے تمام سرداروں کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہ رامو پر رک گئی۔ رامو کے دل کی بے چینی بڑھنے لگی۔ سکھدیو مسکرایا اور کہنے لگا:

"بھائیو! اگر تمہیں میرا فیصلہ منظور ہو تو رامو کو اپنا سردار بنا لو۔"

تمام سرداروں نے سکھدیو کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔ رامو

کے سر پر سرداری کی پگڑی باندھی گئی لیکن وہ اپنے دل میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کامیابی کا سہرا سکھدیو کے سر ہے۔ وہ لوگوں کے جسم پر حکومت کر سکے گا لیکن ان کے دلوں پر بدستور سکھدیو کا قبضہ رہے گا۔ سکھدیو کی طرف سے ایثار اور مروت کے چھینٹے اس کے دل سے حسد کی آگ نہ بجھا سکے؟

رامو کی سرگزشت

رامو نے ایک سال کے اندر اندر یہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کو اس سے بہتر سردار نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی سرداری کا زمانہ ان لوگوں کے لیے ایک نئے دور کی ابتدا تھی وہ ماہی گیری اور گلہ بانی کی نسبت کاشت کاری کو زیادہ پسند کرتا تھا چنانچہ اس کی ان تھک کوششوں سے جھیل کے کنارے سے لے کر دریا کے ساحل تک کے ایک وسیع علاقے میں جنگلی درختوں کی بجائے لہلہاتی کھیتیاں نظر آنے لگیں اور ان لوگوں میں بھیڑ بکریوں کی جگہ گائیں پالنے کا شوق بڑھنے لگا رامو کو گھاس پھونس کی جھونپڑیوں سے نفرت تھی اس لیے اس نے اپنی قوم کو مٹی کے گھر بنانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں بعض لوگ جھونپڑیوں سے نکل کر مٹی کے کشادہ مکانوں میں آباد ہونے لگے۔ لیکن اکثر نے اس معاملے میں رجعت پسندی کا ثبوت دیا۔

سکھدیو یہ سب کچھ ایک پُرامن تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا اور کسی بات میں مداخلت نہ کرتا۔ موتی کی موت کے بعد ان لوگوں کے سیاسی معاملات میں اس کی تمام دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ لوگ بدستور اس کے پاس آتے اور رامو کی نئی نئی اصلاحات کے متعلق اس کی رائے دریافت کرتے وہ انہیں صرف اتنا کہہ کر ٹال دیتا کہ تمہارا سردار جو کچھ کر رہا ہے اچھا کر رہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ سکھدیو کے ساتھ ان کی دلچسپی کم

ہونے لگی اور وہ راموکی نئی نئی اصلاحات کی طرف توجہ دینے لگے۔ رامونے مہذب سماج کی ترقی کے افسانے سنا سنا کر ان لوگوں میں نئی امنگیں اور ولولے بیدار کر دیے اور لوگ اپنی موجودہ زندگی کو قابلِ رحم محسوس کرتے ہوئے اس کے اشاروں پر چلنے لگے۔

سکھدیو دیر تک یہی خیال کرتا رہا کہ رامو اپنی جلاوطنی کے زمانے میں کسی شہر میں اونچی ذات والوں کو عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہو چکا ہے اور وہ ان لوگوں کی حالت بہتر بنانے کی فکر میں ہے لیکن ایک دن رامونے اس پر اپنے تمام ارادے ظاہر کر دیے اور سکھدیو کو اپنی زندگی کے پُرسکون سمندر میں کسی نئے طوفان کے آثار نظر آنے لگے۔

---

(۲)

دوپہر کے وقت سکھدیو اور بدھو جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ مادھو جھیل میں نہا رہا تھا۔ اس پاس بکریاں اور بھیڑیں چر رہی تھیں۔ بدھو نے دور سے گدھے پر ایک سوار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کہا: "بھیا! وہ دیکھو۔ شاید رامو آ رہا ہے۔"

سکھدیو نے بدھو کے اشارے پر اس طرف نظر دوڑائی اور دور سے رامو کو پہچان کر بولا۔

"شاید آج اسے کوئی نئی بات سوجھی ہے۔"

رامو قریب پہنچ کر گدھے سے اترا اور سکھدیو کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "بھائی! میں صبح سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔"

سکھدیو نے پوچھا "کوئی خاص کام تھا؟"

"میں تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتا تھا۔"

"کس کے متعلق؟"

رامو نے بدھو کی طرف دیکھا اور کہا "بدھوا! میں سکھدیو سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم ذرا دوسرے درخت کے نیچے چلے جاؤ۔"

رامو اور سکھدیو کچھ دیر خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے بالآخر رامو نے کہا:

"بھائی! تم جانتے ہو کہ میں اپنے لوگوں کی موجودہ حالت سے خوش نہیں ہوں اور مدت سے ان لوگوں کی حالت بہتر بنانے کے طریقے سوچ رہا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہماری قوم کے ہزاروں انسان پہاڑوں، جنگلوں اور ویرانوں میں مارے مارے پھرتے ہوں اور اس ملک کے زرخیز اور شاداب میدانوں پر اونچی ذات والوں کا قبضہ ہو۔"

سکھدیو نے جواب دیا "اس بات کا مجھے بھی دکھ ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کو ہماری قوم سے بہت ہمدردی ہے لیکن آج تک آپ نے ان لوگوں کی حالت بہتر بنانے کی کوئی تدبیر نہیں نکالی۔"

سکھدیو نے کہا "اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ کی قوم کے وہ تمام گروہ جو دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اونچی ذات والوں سے جنگ کر کے اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لیں لیکن ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرونا میرے یا آپ جیسے کسی انسان کا کام نہیں اس قوم کے بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی بدحالی کا احساس ہے لیکن لاکھوں ایسے ہیں جو ہندو سماج کے سائے میں ایک ذلیل زندگی بسر کرنے

کے باوجود خوش ہیں اور وہ اپنے کھوئے ہوئے حقوق کے لیے جنگ کرنے کا خیال بھی پاپ سمجھتے ہیں۔"

رامو نے جواب دیا "میں یہ نہیں چاہتا کہ سماج والوں سے جنگ کی جائے مجھے یقین ہے کہ ہم تمام مل کر بھی ان پر فتح حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ وہ لوگ دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور یہ طاقتور دیوتا اپنے پجاریوں پر کسی کو غالب نہیں آنے دیں گے آپ اگر ان دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتے تو اور بات ہے لیکن آج میں آپ کے سامنے اپنی زندگی کا وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو آج تک میں نے کسی اور کو نہیں سنایا۔

آپ یہ سن چکے ہیں کہ ان لوگوں نے مجھے جلاوطن کر دیا تھا۔ میں نے چند مہینے اپنی قوم کے چرواہوں کی مختلف بستیوں میں چکر لگانے کے بعد دریائے راوی عبور کیا اور کئی دن سفر کر کے ایک بستی میں پہنچا۔ اس بستی کے قریب اونچی ذات والوں کا ایک بڑا شہر آباد تھا۔ بستی کے لوگ ہماری قوم سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ اونچی ذات والوں کے غلام تھے اور شودر کہلاتے تھے۔ ان کی زندگی ہمارے کتوں کی زندگی سے زیادہ ذلیل تھی۔ ان کے کتے اونچی ذات والوں کے شہر میں جا سکتے تھے لیکن انہیں یہ اجازت نہ تھی۔ دور سے شہر والوں کے خوبصورت محل اور اونچے اونچے مندر دیکھ کر میرے دل میں ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اس بستی میں ڈیرا ڈال دیا۔ کچھ عرصہ اس جگہ رہ کر مجھے معلوم ہوا کہ پڑوس کا شہر آباد ہونے سے کئی برس پہلے اس جگہ ان لوگوں کی بہت سی بستیاں آباد تھیں۔ چراگاہیں بہت اچھی تھیں۔ یہ لوگ آرام کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن ایک دفعہ اونچی ذات والوں کا ایک قافلہ آیا اور اس زمین کی زرخیزی اور شادابی دیکھ کر اسی جگہ آباد ہو گیا۔ چند برسوں میں انہوں نے تمام قابلِ کاشت زمین ان لوگوں سے چھین لی اور ان کے لیے جنگل کا کچھ علاقہ چھوڑ دیا۔ ان میں سے اکثر اونچی

ذات والوں کے مظالم سے تنگ آ کر کہیں دور جا آباد ہوئے لیکن بعض اپنے آباؤ اجداد کا [illegible] سے چمٹے رہے۔

اونچی ذات والوں کا گاؤں بڑھتے بڑھتے ایک شہر بن گیا اور ان لوگوں کی تمام بستیاں اجڑتے اجڑتے ایک بستی رہ گئی۔ یہ بستی بھی اجڑ جاتی لیکن شہر والوں کو برسات کے پانی کا سیلاب روکنے کے لیے کبھی کبھی ان لوگوں کی خدمات کی ضرورت پڑتی تھی اس لیے شہر کے راجہ نے یہ حکم دے دیا کہ کوئی شودر اس بستی سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے اگر کوئی جانا چاہے تو اسے اپنے ساتھ مویشی لے جانے کا حق نہیں۔ یہ حکم سن کر چند آدمیوں نے رات کے وقت فرار ہونے کی کوشش کی لیکن راجہ کے سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور انہیں تعاقب کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ دو تین نوجوان جنہوں نے لڑ بھڑ کر نکل جانے کی کوشش کی انہیں کالی دیوی کے مندر میں لے جا کر قتل کیا گیا۔ جو باقی تھے ان کا قصور اس شرط پر معاف کر دیا گیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔

اونچی ذات والوں کی نظر میں یہ لوگ ان جانوروں کا درجہ رکھتے تھے جنہیں ہم ضرورت کے وقت شکار کر لیتے ہیں لیکن ان کی نسل کو ختم کر دینا پسند نہیں کرتے سال میں ایک دو مرتبہ ان لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی کسی اونچی ذات والے کی پوتر زبان سے کوئی بھجن سن لینے یا سورج نکلنے سے پہلے اسے منہ دکھانے کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا اور کالی دیوی کو خوش کرنے کے لیے اس کا بلیدان کر دیا جاتا۔

میں نے ان لوگوں کو اونچی ذات والوں کے خلاف بغاوت کے لیے اکسانے کی کوشش کی لیکن مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ان سے نہیں بلکہ ان کے دیوتاؤں سے ڈرتے ہیں۔ ان لوگوں کی زبانی دیوتاؤں کی طاقت کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں سن کر میرے دل پر دیوتاؤں کا رعب بیٹھنے لگا۔ مجھے اس بات کا یقین

ہونے لگا کہ یہ لوگ چونکہ دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے سامنے قربانیاں پیش کرتے ہیں اس لیے وہ ان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرتے تو وہ یقیناً ہمارا ساتھ بھی دیتے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید ہماری قوم بھی کسی زمانے میں ان دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہو اور اب انہیں بھلا دینے کی سزا بھگت رہی ہو کئی دن سوچنے کے بعد میرے دل میں سماج کے زبردست دیوتاؤں کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں ایک رات خواب میں دیوتاؤں کی عجیب و غریب صورتیں دیکھنے کے بعد آنکھ کھلتے ہی دیوتاؤں کے قدموں تک پہنچنے کے راستے میں تمام خطرات اور رکاوٹوں کی پروا نہ کرتے ہوئے شہر کے مندر کی طرف چل دیا۔"

---

(۳)

"ہر قدم پر میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری بھٹکی ہوئی قوم میرے پیچھے آ رہی ہے اور بڑے بڑے دیوتا میری التجائیں سننے اور میری قوم کے پچھلے گناہ معاف کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ پچھلے پہر کا چاند نمودار ہو رہا تھا۔ راستے میں مجھے کئی بار خیال آیا کہ واپس لوٹ جاؤں لیکن میری ہمت نے میرے عزم کا ساتھ دیا اور میں ٹھہر ٹھہر کر سوچتا اور رک رک کر چلتا ہوا مندر کے قریب جا پہنچا۔

مندر سے باہر ایک کھلے میدان میں چند آدمی جو شاید مندر کے رکھوالے تھے گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے دبے پاؤں مندر کے دروازے کے قریب پہنچ کر اندر جھانکا۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی دھیمی روشنی میں مجھے عجیب و غریب صورتیں نظر آئیں۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں لیکن کوئی زبردست طاقت مجھے آگے دھکیل رہی تھی اور میں ڈرتے ڈرتے مندر کے

وسیع کمرے میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بدحواس ہو کر دیوتاؤں کی عجیب و غریب مورتیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ان دیوتاؤں میں سے کسی کے پاؤں پر سر رکھوں کہ اچانک میری نظر مندر کی بائیں دیوار کی طرف جا پڑی اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سیاہ پتھر کے ایک چبوترے پر چند معمولی پتھر کی مورتیوں کے درمیان سنگِ مرمر کی ایک خوبصورت مورتی نصب تھی اس کے گلے میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے ہار تھے اور پاؤں پر بھی پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہی سماج والوں کا بھگوان اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ یہی وہ زبردست طاقت ہے جو اپنی پوجا کرنے والوں کو رہنے کے لیے خوب صورت محل اور کھیتی باڑی کے لیے زرخیز زمین دیتی ہے یہی وہ دیوتا ہے جس سے دور رہ کر ہم دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم ہیں۔

میں اس دیوتا کے پاؤں پر سر رکھ کر اپنی بھٹکی ہوئی قوم کے لیے رحم کی درخواست کرنا چاہتا تھا لیکن میرے دل میں ایک نیا خیال آیا اور یہ خیال اچانک ایک خوفناک ارادے میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اس دیوتا کے سامنے میری دعا میری قوم کے گناہ معاف نہیں کرا سکتی۔ سب کی بھلائی کے لیے سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے لیکن میری طرح سب اس مندر میں نہیں آ سکتے مگر میں اس دیوتا کی مورتی کو آسانی سے اٹھا کر لے جا سکتا ہوں۔ میری قوم کو اس کی ضرورت ہے وہ سماج کے شہر سے دور اس کے لیے ایک نیا مندر بنا سکتی ہے۔ دریا کے کنارے پھولوں کی کمی نہیں۔ ہم مرجھائے ہوئے پھولوں کی بجائے ہر وقت تازہ پھول اس دیوتا پر نچھاور کرتے رہیں گے اور دن رات اس کی پوجا کریں گے۔

سماج کے مندروں میں دیوتاؤں کی کمی نہیں وہ ایسی مورتیاں بنانا جانتے ہیں اور بنالیں گے ۔ صبح ہونے والی تھی اور زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا میں نے آگے بڑھ کر دیوتا کے سامنے ہاتھ باندھ کر نہایت عاجزی سے کہا۔

"بھگوان! میں چوری کر رہا ہوں لیکن تو جانتا ہے میری نیت بُری نہیں میں تجھے ہمیشہ خوش رکھوں گا میری قوم کو تیری ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مورتی کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اسے ہلا کر دیکھا وزن زیادہ نہ تھا میں نے دل مضبوط کیا اور مورتی کو اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھنے کو تھا میں نے جلدی جلدی چند قدم اٹھائے لیکن جونہی میں نے مورتی اٹھائی اس کا سر چھت سے لٹکنے والی گھنٹیوں کے ساتھ جن کا میں نے بدحواسی کی وجہ سے خیال نہیں کیا تھا ٹکرایا اور کمرے میں ٹن ٹن کی مہیب آواز گونج اٹھی میرا دل دہل گیا اور میں بدحواس ہو کر بھاگا لیکن میرا پاؤں دہلیز کے ساتھ ٹکرایا اور میں دیوتا سمیت منہ کے بل آ گرا اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اونچی ذات کے سینکڑوں مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک کھلے میدان میں پڑا ہوں۔ میرے تمام کپڑے خون سے لہولہان ہیں اور میرے پاؤں مضبوط رسیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ میں سماج والوں کی قید میں تھا۔ وہ غضب ناک نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن میرے کان ہزاروں زبانوں سے مندر۔ مورتی۔ اچھوت۔ پاپی اور مہاپاپی کے الفاظ سُن رہے تھے۔

میں دیر تک آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ پیاس سے میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر پانی مانگنا چاہا لیکن کسی نے زور سے کہا "اچھوت ابھی تک ابھی زندہ ہے اور مجھے پانی مانگنے کی جرأت نہ ہوئی۔

شام تک میں وہیں پڑا رہا۔ پیاس مجھے نڈھال کر رہی تھی۔ ان کی غضب ناک نگاہوں سے مجھے رحم کی توقع نہ تھی ان کی شکلیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے لیے کوئی عبرت ناک سزا تجویز کر چکے ہیں۔

سورج غروب ہوتے ہی ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آیا۔ یہ لوگ ادب سے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے آتے ہی ان لوگوں سے کچھ کہا اور یہ تمام کالی دیوی، کالی دیوی، بلیدان، بلیدان کے نعرے لگاتے ہوئے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے اور تھوڑی دیر میں میدان خالی ہو گیا صرف چھ نیزوں اور تلواروں سے مسلح سپاہی میرے قریب کھڑے رہے۔

رات کے وقت چند آدمی مشعلیں لیے ہوئے آئے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اپنی تلوار سے میرے پاؤں کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ ایک شخص پانی کا برتن اٹھا لایا اور میرے قریب پہنچ کر میرے سر پر الٹ دیا۔ میں نے پانی کی دھار کے سامنے اپنا منہ کھول دیا۔ پانی کے چند گھونٹ پیتے ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہوں۔ برتن کا پانی پاؤں کو تر کرتا ہوا زمین پر بہہ گیا میری پیاس ابھی کم نہ ہوئی تھی۔ میرے سامنے ایک چھوٹے سے گڑھے میں کچھ پانی جمع ہو گیا تھا۔ میں نے منہ کے بل لیٹ کر اسے بھی ختم کر ڈالا۔

ایک سپاہی نے میری کمر میں نیزے کی نوک چبھو کر مجھے اٹھنے کا حکم دیا۔ میرے لیے ان لوگوں کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اٹھا اور سپاہیوں کے اشارے پر ان کے ساتھ چل دیا۔ دو آدمی مشعلیں اٹھائے میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے سپاہیوں کے علاوہ عورتوں، مردوں اور بچوں کی ایک خاصی تعداد آ رہی ہے

مجھے معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ چلتے چلتے میں نے اپنی جان بچانے کی ہزاروں تدبیریں سوچیں لیکن مجھے ان لوگوں سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تاہم میرا دل مجھے تسلیاں دے رہا تھا کہ تو مرے گا نہیں۔ کبھی میں یہ سوچتا کہ شاید زلزلہ آ جائے اور یہ لوگ بدحواسی کی حالت میں مجھے چھوڑ کر بھاگ جائیں کبھی میں یہ دعا کرتا کہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آئے اور مجھے اڑا کر لے جائے۔ کبھی چاروں طرف سے مایوس ہو کر میں سماج کے دیوتاؤں کو مدد کے لیے پکارتا۔

مندر کے قریب پہنچ کر یہ لوگ کسی کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ ناقوس اور گھنٹوں کی صدائیں سن کر میرا دل دھڑک رہا تھا ہم مندر کے قریب زیادہ دیر کھڑے نہ رہے۔ وہی بڑی بڑی مونچھوں والا شخص جسے میں نے شام کے وقت دیکھا تھا۔ آیا۔ سپاہیوں نے مجھے چلنے کے لیے اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں موت کے منہ کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں اور کوئی طاقت مجھے اب بچا نہیں سکتی۔ میں نے اچانک یہ ارادہ کیا کہ میں بزدلوں کی طرح جان نہیں دوں گا اور مرنے سے پہلے آخری بار اپنی جان بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ زخمی ہونے کے باوجود میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میں ان موٹے اور بدوضع لوگوں کے مقابلے میں بہت طاقتور ہوں لیکن میرے ہاتھ خالی تھے اور صرف ٹانگیں تھیں جو میرا آخری سہارا بن سکتی تھیں۔

مندر میں پاؤں رکھتے ہی بے شمار چراغوں کی تیز روشنی میں مجھے کالی دیوی کی مورتی نظر آئی اور میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اس کا اندھیری رات سے زیادہ تاریک چہرہ اس کی چمکتی ہوئی مہیب آنکھیں۔ اس کی دو ہاتھ لمبی زبان ـــ میں نے خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ آج بھی اس کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی کسی عجیب و غریب زبان میں کچھ گانے لگا۔ گاتے گاتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک موٹا اور بدوضع شخص ایک بہت بڑا کلہاڑا اٹھا کر میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس نے پھر ایک نیا راگ شروع کیا اور گاتے گاتے دوسری بار کلہاڑا اٹھانے والے شخص کو ہاتھ کا اشارہ کیا اس نے کلہاڑا بلند کیا۔

دنیا میں موت سے زیادہ خوف ناک شے کوئی نہیں۔ موت کے خوف کے سامنے کالی دیوی کا خوف جاتا رہا۔ میرا دل پھٹنے لگا۔ ایک آگ تھی جو میری رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھا اور اپنے راستے میں نیزوں اور تلواروں کے بلند ہونے سے پہلے ہی کسی کو دھکیلتا، کسی کو گراتا اور کسی کے اوپر سے پھاندتا ہوا مندر سے باہر نکل گیا۔

ایک سپاہی کا نیزہ میری ران پر معمولی سی خراش پیدا کرتا ہوا گزر گیا دوسرے کی تلوار سے میری کھوپڑی ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوتے بچ گئی۔ مندر سے باہر تاریکی میں مجھے ایک لمحے کے لیے کچھ نظر نہ آیا۔ جو لوگ وہاں کھڑے تھے۔ بدحواس ہو کر میرے راستے سے ہٹ گئے اور جب وہ اپنے ہوش و حواس پر قابو پا کر میرے تعاقب میں دوڑے میں مندر سے کافی دور آ چکا تھا۔ ایک سپاہی نے جو اپنے ساتھیوں سے تیز رفتار تھا مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتے دیا وہ میرے پیچھے بھاگتا ہوا اپنے دوسرے ساتھیوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے کئی بار اپنا رخ بدلا لیکن جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس سے بچ نکلنا آسان نہیں۔ میرے ذہن میں فوراً ایک تدبیر آئی۔ میں نے ادھر ادھر مڑنے کی بجائے سیدھا بھاگنا شروع کیا اور اپنی رفتار ذرا کم کر دی۔ جب میرے اور اس کے درمیان، پانچ سات قدم کا فاصلہ رہ گیا اور اس نے حملہ کرنے کی نیت سے

تلوار اٹھائی تو میں اچانک رکا اور زمین پہ ہاتھ ٹیک کر اس کے راستے میں بیٹھ گیا وہ عین وقت پر اپنی رفتار کم نہ کر سکا۔ اس کی ٹانگیں میرے جسم کے ساتھ ٹکرائیں اور وہ قلابازی کھاتا ہوا سر کے بل زمین پر آ گرا۔ میں نے اٹھ کر بھاگنا شروع کیا اور دیر تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ تعاقب کرنے والوں کی آوازیں مجھے بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

باغوں اور کھیتوں کو عبور کرنے کے بعد میں نے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ مندر کے آس پاس ابھی تک مشعلیں لیے پھر رہے تھے۔ ٹیلے سے نیچے اترنے کے بعد دوڑنے کی ہمت نہ تھی اور میں معمولی رفتار سے رات بھر چلتا رہا۔

پچھلے پہر جب چاند نمودار ہوا میں دریا کے کنارے پہنچ چکا تھا وہاں مجھے اپنی قوم کا ایک چرواہا ملا۔ اس نے مجھے دودھ پلایا۔ میں تھکاوٹ سے چور تھا اور چاہتا تھا کہ وہیں سو جاؤں لیکن مجھے اطمینان نہ تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کالی دیوی ابھی تک میرا تعاقب کر رہی ہے اور اگر میں سو گیا تو میرا گلا گھونٹ ڈالے گی۔ میں نے ذرا تازہ دم ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ تیرنے میں مجھے کافی مہارت تھی تاہم اب بھی مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کہیں کالی دیوی مگرمچھ بن کر نہ آ جائے دریا عبور کرنے کے بعد میں چھ دن ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ ساتویں روز اس جگہ پہنچ گیا"

رامو یہاں تک پہنچ کر رک گیا اور سکھدیو کی طرف دیکھنے لگا۔ سکھدیو کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ رامو کی خاموشی پر اس نے آہستہ سے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہا "ان باتوں کے باوجود تم سماج کے دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہو۔"

رامو نے جواب دیا "میں نے ابھی بات پوری نہیں کی پہلے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ سن لو۔"

اب میں ان تمام واقعات کے بعد صرف ایک بات پر یقین رکھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ سماج والوں کی طاقت کا راز سنگِ مرمر کے خوب صورت دیوتاؤں میں نہیں بلکہ کالی دیوی کی مہیب مورتی میں ہے ممکن ہے کہ اچھے دیوتا بھی کسی طاقت کے مالک ہوں لیکن ہمارے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ کالی دیوی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ کالی دیوی انہیں اچھوتوں کو مغلوب رکھنے کا سبق دیتی ہے انہیں ہمارے ساتھ نفرت سے پیش آنا اور ہم پر ظلم کرنا سکھاتی ہے ہم اس وقت تک ان لوگوں کی برابری نہیں کر سکتے جب تک ہمارے پاس کالی دیوی جیسی طاقت نہ ہو جو ہمیں یہ سکھائے کہ اونچی ذات والے تمہارے دشمن ہیں۔ ان کے شہر لوٹ لو۔ ان کی زمینیں چھین لو انہیں رسیوں میں جکڑ کر میرے سامنے قربان کرو۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اگر ہم پتھر کے ٹکڑے کو تراش کر کسی ڈراؤنی شکل میں تبدیل کر لیں تو اس میں زبردست طاقت بھی پیدا ہو جائے گی لیکن یہ دعویٰ ضرور کرتا ہوں کہ ہم اپنے یقین کے ساتھ اس میں ایک زبردست قوت پیدا کر سکتے ہیں اگر ہم بھی اپنی مورتیوں کے سامنے اپنے دشمن کو قتل کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح ہم ان کے دیوتاؤں سے ڈرتے ہیں وہ بھی ہمارے دیوتاؤں سے نہ ڈریں"

یہاں تک کہہ کر رامو جوش میں آ گیا اور اپنا مکا بلند کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہنے لگا "سکھدیو! سکھدیو!! غور سے سنو ہمیں صرف پتھر کے ایک تراشے ہوئے ٹکڑے کی ضرورت ہے خواہ اس میں کوئی طاقت ہو یا نہ ہو اس کے بعد تم دیکھو گے کہ جس طرح ہم اونچی ذات کے لوگوں سے ڈرتے ہیں اسی طرح وہ ہم سے ڈریں گے۔ جس طرح وہ ہماری بستیوں کو لوٹتے ہیں ہم ان کے شہروں کو لوٹیں گے جس طرح وہ ہمیں اچھوت سمجھتے ہیں ہم انہیں اچھوت سمجھیں گے جس طرح ہمیں انہوں نے زرخیز اور سرسبز میدانوں سے نکال کر ان پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی طرح ہم

ان کے ہرے بھرے باغ اور لہلہاتی کھیتیاں چھین کر انہیں جنگلوں اور بیابانوں کی طرف دھکیل دیں گے۔ سکھدیو! تم نے کہا تھا کہ ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرونا آسان بات نہیں لیکن میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اپنے دیوتا کی محبت اور اونچی ذات کی دشمنی ان بکھرے ہوئے دانوں کو چند دنوں کے اندر ایک لڑی میں پرو دے گی۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جسے کسی کام میں اپنی بہتری نظر آئے اور وہ اسے نہ کرے۔ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو صرف محلات کے خواب دکھانے کی ضرورت ہے۔

میں نے بھی باتیں موتی سے کہی تھیں لیکن اس کا سر چھوٹا اور دل کمزور تھا اب میں اس ارادے کو پورا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں لیکن اپنی قوم کے ایک گروہ کا سردار ہوتے ہوئے بھی میں تمہاری مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں کنول کے باپ کی کہانی سن چکا ہوں اور تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ تم اپنے لیے نہیں تو کم از کم کنول کے باپ کا انتقام لینے کے لیے ہی میرا ساتھ دو گے۔ کیوں سکھدیو تمہارا کیا خیال ہے؟"

سکھدیو دیر تک سوچنے کے باوجود اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ راموکی اصلیت آج تک اس کی آنکھوں سے چھپی رہی ہے۔

سکھدیو کو خاموش دیکھ کر رامو نے کہا "میں جانتا تھا کہ اپنی قوم کی محبت تمہیں میرا ساتھ دینے کی اجازت نہ دے گی۔ تمہارا خون ضرور جوش مارے گا لیکن میں تم سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ میرے راستے میں کانٹا نہ بننا۔ میں تمہارا دوست ہوں لیکن کانٹوں کو اپنے راستے سے دور کرنا انسان کی فطرت ہے۔"

"رامو!" سکھدیو نے مغموم لہجے میں کہا "مجھے ان لوگوں سے محبت نہیں اگر تمہاری قوم سماج سے اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لے لے تو مجھ سے زیادہ

خوشی شاید تمہیں بھی نہ ہو لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ پتھر کی وہ مورتیں جنہوں نے سماج والوں کے دل پتھر بنا دیئے ہیں تمہاری قوم کے سادہ اور رحم دل لوگوں کو بھی خونخوار درندوں میں تبدیل کر دیں۔ میں ایک زبردست اور انصاف پسند طاقت کا قائل ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب اس کی مرضی ہوگی وہ کسی ایسے طاقتور انسان کو بھیجے گی جو دیوتاؤں کی مدد کے بغیر چھوت اور اچھوت کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے گا جو اونچی ذات کے دل سے صدیوں کی سیاہی دھو ڈالے گا۔ جو مدتوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ملا دے گا۔ میں کسی ایسے دیوتا کی تلاش میں ہوں جس کی پوجا ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرنا سکھائے۔"

رامو نے کہا "سکھدیو! تم تمام عمر خواب دیکھتے رہو گے لیکن میں اپنی عمر کا باقی حصہ تمہاری طرح ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس زبردست اور انصاف پسند طاقت کی راہ نہیں دیکھوں گا جو برسوں سے کہیں سو رہی ہے۔ اونچی ذات والے کسی زبردست اور انصاف پسند طاقت کی مرضی کے بغیر ہم پر حکمران ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ طاقت ہمارے راستے میں بھی روڑے نہیں اٹکائے گی۔ میں صرف تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم میری مخالفت نہیں کرو گے۔"

سکھدیو نے جواب دیا "میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا لیکن تمہارا ساتھ بھی نہیں دوں گا۔"

رامو نے اٹھتے ہوئے کہا:

"یہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اچھا اب جاتا ہوں۔ تم چند دن میں دیکھو گے کہ ایک نئے دیوتا کی آواز ہماری قوم کو کہاں کہاں سے لا کر ایک جگہ اکٹھا کرتی ہے۔"

سکھدیو خاموش رہا۔ رامو اپنے گدھے پر سوار ہو کر چل دیا۔ اس کے رخصت

ہوتے ہی بدھو بھاگا ہُوا سکھدیو کے پاس آیا اور پوچھنے لگا :

"وہ مکّا اٹھا اٹھا کر آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟ بھیّا سچ کہتا ہوں میں کلہاڑی اٹھائے تیار بیٹھا تھا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ آج بچ کر نہ جاتا۔ آخر کیا بک رہا تھا وُہ؟"

"کچھ نہیں بدھو! کوئی خاص بات نہیں تھی!"

نیا دیوتا

ساون کا مہینہ ان لوگوں کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لایا۔ رامو کئی مہینے پہلے آس پاس کی تمام بستیوں کے لوگوں کو ایک نئے دیوتا کی آمد آمد کی خبر دے چکا تھا۔ اس کی تقریروں کی بدولت کسی کے دل میں آنے والے دیوتا کی زبردست طاقت کا رعب اور کسی کے دل میں اس کی محبت پیدا ہو رہی تھی۔ رامو اس دیوتا کے لیے جھیل کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر پیپل کے ایک درخت کے سائے میں مٹی کا چبوترا بنوا چکا تھا۔ آنے والے دیوتا کے لیے پھولوں کی ضرورت کا احساس کر کے اس نے لوگوں کو جھیل سے کنول کے پھُول توڑنے کی ممانعت کر دی تھی۔

ان لوگوں میں سکھدیو کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جسے دیوتا کا انتظار صبح و شام ٹیلے پر نہ لے جاتا۔ کوئی علی الصباح یہ خبر لے کر آتا، کہ میں نے رات کے وقت دیوتا کو اپنی آنکھوں سے چبوترے پر دیکھا ہے اور وہ مجھے دیکھ کر غائب ہو گیا تھا کوئی شام کے وقت یہ خبر مشہور کرتا کہ دیوتا آج پو پھٹنے سے پہلے جھیل میں نہا رہا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اس نے پانی میں غوطہ لگا دیا اور پھر باہر نہ نکلا۔ کوئی یہ افواہ اڑا دیتا کہ اس نے دیوتا کو آدھی رات کے وقت چبوترے پر ناچتے دیکھا ہے۔ غرض یہ سادہ دل لوگ آہستہ آہستہ رامو کی تقریروں سے متاثر ہو کر اس کے کانوں سے سننے اور اس کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو رہے تھے۔

سکھدیو ان باتوں سے الگ تھلگ رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ لوگ اپنی تسلی کے لیے آنے والے دیوتا کے متعلق اس کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتے لیکن وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انہیں ٹال دیتا۔ بدھو، راموکی ہر بات سے نفرت کرنے کا عادی تھا لیکن نئے دیوتا کے متعلق ہر روز ایک نئی کہانی سننے کے بعد اسے بھی آہستہ آہستہ ان باتوں کے ساتھ دلچسپی ہو رہی تھی۔ کسی سے جب وہ یہ سنتا کہ نیا دیوتا ان کے جھونپڑوں کو محلات میں تبدیل کر دے گا۔ اور ان کی غیر آباد زمین پر پھل پھول اور اناج کی بارش کرے گا۔ تو وہ خوش ہونے کی بجائے اس بات پر افسوس کرتا کہ دیوتا کے ساتھ ساتھ راموکے نام کی شہرت بڑھے گی اور لوگ سکھدیو سے زیادہ اس کی عزت کریں گے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ سکھدیو کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ جو لوگ راموسے نفرت کرتے تھے اب اس کے گرویدہ ہو رہے ہیں اور جب نیا دیوتا آئے گا تو سکھدیو کو یہ لوگ بالکل بھول جائیں گے۔

اس سے زیادہ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ بستی کی عورتیں جو کنول کے پاس ہر وقت جمع رہتی تھیں اور اس کے پاؤں پر سر رکھتی تھیں اب ان کی توجہ رامو کے گھر کی طرف ہو رہی تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ نہایت بیتابی سے نئے دیوتا کا انتظار کر رہا تھا۔

---

(۲)

ایک صبح آسمان پر سیاہ بادلوں کے قافلے مشرق سے مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ ساون کی بھیگی ہوئی ہوا کے خوشگوار جھونکے آ رہے تھے۔ سکھدیو مکان

کے صحن میں چارپائی پر بیٹھا ہوا، ہوا میں اڑنے والے سفید بگلوں کی طرف دیکھ رہا تھا کنول بکریوں کا دودھ دوہ رہی تھی۔ مادھو اور شانتا صحن کے ایک کونے میں بارش سے بھیگی ہوئی مٹی کھود کر ایک چھوٹا سا کنواں بنا رہے تھے۔ کنول دودھ دوہ کر اٹھی اور مٹی کا ایک کٹورا بھر کر سکھدیو کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ سکھدیو کسی گہرے خیال سے بیدار ہوا اور اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے "طوفان! ایک اور طوفان!!"

کنول نے پریشان ہو کر کہا "کیسا طوفان! آپ صبح سے کیا سوچ رہے ہیں۔ لیجئے دودھ۔ بدھو مچھلی دے گیا ہے میں ابھی پکاتی ہوں۔"

سکھدیو نے کنول کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لیتے ہوئے کہا "کنول! شاید یہ میری زندگی کا آخری طوفان ہو۔"

"آپ کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

سکھدیو نے دودھ پی کر کنول کو پیالہ واپس دے دیا۔

بدھو باہر سے ہانپتا ہوا آیا اور صحن میں پاؤں رکھتے ہی چلانے لگا۔ "بھیّا۔ وہ آ گیا! وہ آ گیا! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

سکھدیو نے پوچھا "کون آ گیا؟ تم اتنے بدحواس کیوں ہو گئے ہو؟"

"دیوتا! راموکا دیوتا!! جھیل کے کنارے چبوترے پر بیٹھا ہوا ہے میں اسے دیکھ آیا ہوں۔ اُف! کتنی لمبی زبان ہے اس کی۔ مجھے ڈر لگتا تھا۔ لوگوں نے اس کے سامنے پھولوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ میں بھی بہت سے پھول پھینک آیا ہوں۔ چلیے بھیّا! تم بھی دیکھو۔"

بدھو کی توقع کے خلاف سکھدیو نے یہ خبر نہایت سکون کے ساتھ سنی اور بے پروائی سے جواب دیا "تم جاؤ! میں آج تمہاری بکریاں لے جاؤں گا۔"

"بھیا! میں مذاق نہیں کرتا میں سچ مچ اسے دیکھ آیا ہوں۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ تم مذاق کرتے ہو لیکن مجھے تمہارے دیوتا سے کوئی دل چسپی نہیں۔"

"بھیا! اگر تم مجھ سے خفا ہو تو میں کبھی وہاں نہیں جاؤں گا۔ دیوتا خواہ کیسا بھی ہو میرے لیے تم سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو میں بھی وہاں کبھی نہیں جاؤں گا لیکن میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ہے کیا؟ وہ نہ بولتا ہے، نہ ہلتا ہے، نہ آنکھیں جھپکتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانس بھی نہیں لیتا۔"

"بدھو! تمہیں اس کے متعلق رامو نے کچھ نہیں بتایا؟"

"بھیا! رامو تو اس کے متعلق بڑی عجیب باتیں سناتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ وہ ہمارے لیے بڑے بڑے محل بنائے گا کبھی یہ کہتا ہے کہ وہ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں سے جنگ کر کے انہیں ملک سے نکال دے گا اور ان کے باغ، ان کی کھیتیاں اور ان کی چراگاہیں چھین کر ہمیں دے دے گا لیکن میں اس بات سے حیران ہوں کہ وہ ٹیلے پر چپ چاپ بیٹھ کر یہ تمام کام کس طرح کر لے گا!"

سکھدیو نے بے پروائی سے جواب دیا "یہ بھی تمہیں رامو سے ہی پوچھنا چاہیے"

بدھو نے سکھدیو کے قریب چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بھیا! دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جس کے متعلق رامو کو علم ہو اور آپ کو اس کے متعلق کچھ علم نہ ہو اس دیوتا کے متعلق کوئی بات ایسی ضرور ہے جسے آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ جس دن سے اس دیوتا کی باتیں شروع ہوئی ہیں آپ مغموم رہتے ہیں۔ اس دیوتا کے متعلق لوگ آپ سے بہت کچھ پوچھا کرتے تھے۔ لیکن

آپ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انہیں ٹالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مجھے دوسروں سے واسطہ نہیں لیکن آپ کا سُکھ میرا سُکھ اور آپ کا دُکھ میرا دُکھ ہے بھیا! آپ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہ ہے کیا؟ اور آپ کو کون سی بات پریشان کر رہی ہے۔ آپ نے مجھ سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں چھپائی۔ آخر اب مجھ سے کون سا قصور ہو گیا ہے؟"

بدھو کے سوالات کے جواب میں سکھدیو کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ بولا۔ "بدھو! میں تمہیں اس دیوتا کے متعلق بہت کچھ بتا سکتا تھا لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم کوئی بات دل میں نہیں رکھ سکو گے۔"

بدھو نے جواب دیا۔ "بھیا! دل میں بات وہ رکھتا ہے جو کسی سے ڈرتا ہو لیکن مجھے کسی کا ڈر نہیں۔"

"لیکن میں رامو سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"کیسا وعدہ؟"

"یہی کہ میں دیوتا کے بارے میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔"

"تو میں کب کہتا ہوں کہ آپ اس کی مخالفت کریں۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ یہ دیوتا ہے کیا؟ آخر وہ کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں؟"

سکھدیو نے جواب دیا "بدھو! تم وعدہ کرو کہ تم یہ الفاظ دوسروں کے کانوں تک نہیں پہنچاؤ گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں؟"

"اچھا سنو۔ یہ دیوتا آسمان سے نہیں اُترا۔ یہ پہلے بھی ایک پتھر تھا اور اب بھی ایک پتھر ہے۔"

"پتھر؟" بدھو نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں پتھر، تم پہاڑوں میں لاکھوں پتھر اپنے دیکھتے ہو۔ ان میں اور اس پتھر میں صرف اتنا فرق ہے کہ اسے تراش کر ایک عجیب و غریب انسانی صورت میں تبدیل کیا گیا ہے۔"

اگر بدھو نے رامو کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتی کو چبوترے پر بے حس و حرکت دیکھنے کی بجائے اسے چلتے پھرتے اور باتیں کرتے بھی دیکھا ہوتا تو بھی اسے سکھدیو کی باتوں پر شک نہ گزرتا۔ تاہم اس نے اپنے رہے سہے شکوک رفع کرنے کی نیت سے سوال کیا" لیکن بھیا کئی لوگ پہلے اس دیوتا کو نہاتے، ناچتے اور کودتے دیکھ چکے ہیں۔ کیا وہ سب ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

سکھدیو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا" رامو ایک طاقت ور اور ہوشیار آدمی ہے دوسروں کی زبان سے جو جی چاہے کہلوا سکتا ہے اگر وہ یہ کہہ دے کہ میں نے رات کے وقت ایک بھیڑ کو آسمان کی طرف اڑتے ہوئے دیکھا ہے تو ہزاروں بے وقوف یہ کہنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ ہم نے بھی بھیڑ کو اڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب ذرا سوچو اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں نے رات کے وقت اس دیوتا کو ہاتھی پر سواری کرتے دیکھا ہے تو ان لوگوں میں کتنے ہیں جو میری ہاں میں ہاں نہیں ملائیں گے۔ ایسا قصہ اگر مشہور کر دیا جائے تو پھر تم دیکھو گے کہ بعض لوگ رات کے وقت دور سے ایک درخت دیکھ کر بھی یہی کہیں گے کہ دیوتا ہاتھی پر سوار ہے اور جنگل میں کسی چرواہے کو بنسری بجاتے دیکھ کر انہیں شک گزرے گا کہ دیوتا بنسری بجا رہا ہے۔ تم نے عمر بھر اپنی آنکھوں سے بھوت نہیں دیکھا ہو گا لیکن تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو بھوتوں سے نہ ڈرتا ہو اور اس ڈر کی وجہ یہ ہے کہ تم روز بھوتوں کی کہانیاں سنتے رہتے ہیں اور اندھیری رات میں ہمیں چھوٹی چھوٹی

جھاڑیاں بھی بھوت بن کر ڈراتی ہیں۔ اس دیوتا کے متعلق رامو مدت سے طرح طرح کی باتیں مشہور کر رہا تھا۔ لوگوں نے دیوتا کو اپنی آنکھوں سے ناچتے کودتے نہیں دیکھا بلکہ رامو کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ٹیلے پر اپنے ہاتھ سے تراشا ہوا پتھر رکھنے سے پہلے رامو خود ہی دیوتا بن کر ناچتا کودتا رہا ہو۔"

سکھدیو کا ہر لفظ بدھو کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ سکھدیو نے دنیا بھر کے عقل و حکمت کے خزانے اس کے دماغ میں ٹھونس دیے ہیں۔ بارہا اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بھاگ کر ٹیلے پر پہنچ جائے دیوتا کے قریب چبوترے پر کھڑا ہو کر ایک پرزور قہقہہ لگائے۔ لوگ اس کی طرف حیران ہو کر دیکھیں لیکن اس کی ہنسی کسی طرح بند نہ ہو۔ لوگ اسے ڈرا دھمکا کر چبوترے سے نیچے اتارنے کی کوشش کریں لیکن وہ بلند آواز سے یہ کہتا جائے کہ یہ پتھر ہے یہ پتھر ہے!! اسے رامو نے تراشا ہے وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے ان خیالات کے تحت بدھو کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ وہ بولا:

" بھیا! یہ بہت بڑی شرارت ہے۔ رامو ہم سب کو بے وقوف بنا رہا ہے ہمیں یہ باتیں آج ہی تمام لوگوں کو بتا دینی چاہئیں۔"

سکھدیو نے جواب دیا" رامو یہ سب کچھ تمہاری بھلائی کے لیے کر رہا ہے اس کی نیت بری نہیں۔ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا اس لیے میری بات کسی اور کے کانوں تک پہنچ گئی تو اچھا نہ ہو گا۔"

بدھو کے چہرے پر پھر اداسی چھا گئی۔ اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کی ماں نے اسے کوئی عجیب و غریب کھلونا دے کر ساتھ ہی یہ حکم بھی سنا دیا ہو کہ اسے باہر لے جا کر کسی کو مت دکھانا۔ اس نے ملتجی ہو کر کہا" بھیا! رامو سے مجھے کسی بہتری کی امید نہیں۔ یہ اسے نیچا دکھانے کا وقت ہے۔"

سکھدیو نے جواب دیا "یہ باتیں میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ تم خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔"

"بہت اچھا بھیا! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن وہاں جا کر دیکھیں تو سہی کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔"

"میں تمہیں وہاں جانے سے منع نہیں کرتا لیکن وہاں جا کر کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھنا!"

"آپ اطمینان رکھیے" یہ کہہ کر بدھوا اٹھا اور ٹیلے کی طرف چل دیا۔ بدھو کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ سکھدیو کے دل میں کوئی خیال آیا اور وہ بھی اٹھ کر ٹیلے کی طرف چل دیا۔

---

(۳)

آس پاس کی بستیوں کے لوگ جوق در جوق ٹیلے پر جمع ہو رہے تھے۔ نئے دیوتا کے چبوترے پر پھولوں اور آموں کے انبار لگے ہوتے تھے۔ رامو نے چبوترے سے نیچے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ لوگ رامو کی تقریریں سننے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اس کا اشارہ پاتے ہی خاموش ہو گئے۔

رامو نے دیوتا کے فضائل بیان کرنے کے بعد اپنی قوم کے اس شاندار مستقبل کا نقشہ کھینچنے لگا جس کا راز اس مقدس مورتی کی خوشنودی حاصل کرنے میں تھا۔ پوجا اور قربانی کی اہمیت ظاہر کرنے کے بعد وہ اپنی قوم کو یقین دلا رہا تھا کہ اب وہ ادھر ادھر بھٹکنے والے چرواہے نہیں کہلائیں گے بلکہ عنقریب ان پُر رونق شہروں اور خوبصورت مکانوں پر قبضہ کرنے والے ہیں جن کے نیچے ان

کے آباؤ اجداد کے جھونپڑے دبے ہوئے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان کے راجہ اور رانیاں گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار ہو کر ان کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کریں گے اور اس دیوتا کی مدد سے ان کی فتح ہو گی۔

اپنے راجوں اور رانیوں کا تصور اُن لوگوں کے لیے اس دیوتا کی مدد سے حاصل ہونے والی باقی تمام نعمتوں سے زیادہ دلفریب اور صبر آزما تھا۔ ہر شخص کا دل مسرت سے اچھل رہا تھا۔ سب کی آنکھوں میں امید کی مشعلیں روشن ہو رہی تھیں ہر ایک کی گردن دیوتا کے الطاف و اکرام کے زبردست بوجھ تلے جھکی جا رہی تھی۔ غرض نیا دیوتا ان لوگوں کو رامو کی زبان سے نئی زندگی، نئی روشنی اور نئی مسرتوں کا پیام دے رہا تھا۔

سکھدیو ٹیلے پر نمودار ہوا نئے دیوتا کی آمد کے بعد یہ دیوتا لوگوں کی نظروں میں اگرچہ پرانا ہو چکا تھا۔ تاہم ایک لمحہ کے لیے اس نے سب کی نگاہیں اپنی طرف کھینچ لیں۔ وہ اس کے چہرے سے نئے دیوتا کے متعلق اس کے تاثرات معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی مغموم آنکھیں اور مرجھایا ہوا چہرہ نئی خوشی اور نئی روشنی سے ناآشنا معلوم ہوتا تھا۔

بدھو اسے دیکھتے ہی قریب آ کر کان میں کہنے لگا "آپ انہیں بتاویں کہ یہ سب بے وقوف ہیں گدھے ہیں۔"

سکھدیو نے ماتھے پر شکن ڈالتے ہوئے آہستہ سے "چپ" کہا اور بدھو کے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت ہو گئی۔

رامو نے بدھو اور سکھدیو کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "بھائیو! اب تم ہی بتاؤ کہ دیوتا کو خوش رکھنے میں تمہارا فائدہ ہے یا نقصان"

"فائدہ! فائدہ!!" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

راموں نے کہا "ہم اس دیوتا کو خوش رکھ کر زمین اور آسمان کی تمام نعمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یاد رکھو! اگر یہ دیوتا ناراض ہو گیا تو ہم سب مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس دیوتا کو ناراض کرنے والا ہمارا بدترین دشمن ہوگا۔ اگر کسی نے اس کی پوجا کرنے سے انکار کیا تو ہم اس سرزمین سے اسے نکال دیں گے۔ جو ہمارے پوتر دیوتا کی شان میں گستاخی کرے گا۔ ہم اسے بدترین سزا دیں گے۔"

لوگوں نے بے شک! بے شک!! کہہ کر راموں کی تائید کی۔

راموں کی تقریر کے بعد دیوتا کے قدموں میں ایک بکرے کا سر کاٹا گیا اس کے بعد بادل گرجا اور بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں دیوتا کے پاؤں سے خون کے چھینٹے دھونے لگیں۔ لوگوں کے خیال میں یہ بارش ساون کی معمولی بارش نہ تھی بلکہ دیوتا کی نوازش کا نتیجہ تھا۔

راموں نے لوگوں کو ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے دیوتا کی پوجا کے لیے ٹیلے پر آنے کا حکم دینے کے بعد یہ جلسہ برخاست کیا۔ سکھدیو لوگوں کی توجہ سے بچنا چاہتا تھا لیکن اس کے بعض عقیدت مندوں نے اسے گھیر لیا اور اس دیوتا کے متعلق اس کی زبان سے کچھ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

سکھدیو نے مغموم آواز میں کہا "میں خوش ہوں کہ تمہیں ایک زبردست دیوتا مل گیا ہے۔ لیکن...!" سکھدیو آگے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لوگوں کی مسرور اور مطمئن نگاہوں نے اس کی زبان بند کر دی۔ اس نے انہیں اس خیالی جنت سے نکالنا پسند نہ کیا۔

"لیکن کیا؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"ٹھہرو!" سکھدیو نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بدھو کہاں گیا؟"

ایک شخص نے جواب دیا "وہ ابھی چبوترے کے پاس کھڑا تھا۔"

سکھدیو یہ سنتے ہی لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر اپنا راستہ بناتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھا۔ چبوترے کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ چند نوجوان بدھو کو دھکے دے رہے ہیں اور اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا ہے اور بدھو بلند آواز میں انہیں گالیاں دے رہا ہے۔ سکھدیو بھاگ کر بدھو اور اس پر حملہ کرنے والوں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو!" اس نے ایک نوجوان کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

نوجوان بدھو سے ہاتھ ہٹا کر سکھدیو کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" سکھدیو نے سوال کیا۔

اس کے جواب میں راموں چند قدم آگے بڑھا۔ کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہ راموں کی فتح کا دن تھا وہ اگر چاہتا تو سکھدیو پر بھی ایک کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایک دانا دشمن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سکھدیو اپنی عمر کا ایک حصہ سپاہ گری میں گزار چکا ہے۔ اس پر اچھا وار کرنا عقلمندی نہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی ہے لیکن ختم نہیں ہوئی۔ نئے دیوتا کے احترام کے باوجود کئی ایسے ہیں جو سکھدیو کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی گوارا نہ کریں گے۔

سکھدیو نے پوچھا "بدھو نے کیا جرم کیا ہے؟"

راموں نے جواب دیا "اسی سے پوچھو!"

سکھدیو نے بدھو کی طرف دیکھا اور کہا "بدھو کیا کیا تم نے؟ میں نے تمہیں بار بار تاکید کی تھی کہ کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھنا۔"

بدھو نے جواب دیا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو صرف یہ دیکھنے گیا تھا کہ دیوتا مٹی کا بنا ہوا ہے یا پتھر کا۔"

بدھو کے ان الفاظ کے ساتھ سکھدیو کی ایک معنی خیز نگاہ نے رامو کو پریشان کر دیا اور اسے بنا بنایا کھیل بگڑ جانے کا خدشہ پیدا ہونے لگا لیکن سکھدیو اس دفعہ بھی اس کی توقع سے زیادہ شریف ثابت ہوا۔ اس نے کہا "بھائی! اسے معاف کر دو۔ اس نے کبھی دیوتا دیکھا ہی نہیں۔"

رامو نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "میں جانتا ہوں یہ بے وقوف ہے لیکن آپ اسے سمجھا سکتے ہیں۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ چلو بدھو گھر چلیں!"

بارش کی بڑھتی ہوئی تیزی کے ساتھ ٹیلے پر سے لوگوں کی تعداد میں تدریجاً کمی ہونے لگی۔

لوگوں نے رامو کو چلنے کے لیے کہا لیکن اس نے جواب دیا "تم جاؤ۔ اچھے دیوتا سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

---

(۴)

بدھو، سکھدیو کو گھر پہنچا کر اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ پاس سے بستی کے چند آدمی گزرے۔ وہ دیوتا کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا "لیکن رامو اب وہاں کیا کرتا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا "ارے سنا نہیں تم نے۔ کوئی کہہ رہا تھا وہ دیوتا کے ساتھ علیحدگی میں باتیں کرے گا۔"

"دیوتا کے ساتھ باتیں۔" باقی سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"بھئی! یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

پہلے شخص نے کہا "بھئی! سچ پوچھو تو اب کوئی بات بھی عجیب معلوم نہیں ہوتی اب پتہ نہیں کیا کچھ ہو گا!"

یہ لوگ باتیں کرتے ہوئے گزر گئے۔ بدھو دیر تک بارش میں کھڑا رہا۔ بالآخر وہ اپنے دل میں "یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔" کہتا ہوا بھاگ کر گھر پہنچا۔ اور وہاں سے کلہاڑی اٹھا کر پھر ٹیلے کی طرف چل دیا۔

بدھو پیپل کے درخت کی طرف سے ٹیلے پر چڑھا اور درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر چبوترے کی طرف دیکھنے لگا۔

رامو بارش سے بے پروا چبوترے پر بیٹھا آم کھا کھا کر دیوتا کے سامنے گٹھلیوں اور چھلکوں کا ڈھیر لگا رہا تھا۔

اس نے پیٹ بھرنے کے بعد مورتی کی طرف دیکھا اور کہا:

"اچھے دیوتا! اب میرے پیٹ میں جگہ نہیں۔ تم بہت کھا چکے ہو یہ گٹھلیاں اور چھلکے تمہاری اشتہا کا ثبوت دینے کے لیے کافی ہیں میں کھاؤں گا۔ تمہاری شہرت ہو گی لیکن میں نے تمہیں صرف آم کھانے کے لیے نہیں بنایا۔ خون پینے کے لیے بنایا ہے، اپنے دشمنوں کا خون۔ اپنی قوم کے دشمنوں کا خون۔ بدھو جیسے بے وقوفوں اور سکھدیو جیسے عقل مندوں کا خون۔ راجوں اور مہاراجوں کا خون۔ اچھے دیوتا۔ میں تیرے سامنے خون کی ندیاں بہا دوں گا۔ تیری خوشی کے لیے نہیں، اپنی خوشی کے لیے۔ میں جانتا ہوں تیرے لیے خوشی اور غم کوئی شے نہیں۔ تو پتھر ہے لیکن ایک انسان تجھ سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔ اب شام ہو رہی ہے میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رامو چبوترے سے نیچے اترا۔ لیکن چند قدم چل کر پھر رک گیا اور مورتی کی طرف دیکھ کر بولا "تیری حفاظت، تیری حفاظت میں کروں گا جس نے

تجھے بنایا ہے وہ تجھے توڑ ڈالیں گے ؟" نہیں اُن میں یہ جرأت نہیں لیکن اگر توڑ بھی ڈالیں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں اور بنا لوں گا۔ جب تک پہاڑوں میں پتھر موجود ہیں۔ اس ٹیلے پر تجھ سے ملتی جلتی کوئی نہ کوئی صورت موجود رہیگی۔"

یہ کہہ کر رامو واپس مڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔

شام کی ہلکی ہلکی سیاہی شب کی تاریکی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ بارش کی تیزی کا وہی عالم تھا۔ بدھو دبے پاؤں درخت کی آڑ سے نمودار ہوا اور چبوترے پر بیٹھ کر بچے کھچے آم کھانے لگا۔ ایک آم ذرا ترش نکلا۔ بدھو نے اسے غصے سے مورتی کے منہ پر دے مارا اور کہا: "رامو بدمعاش میٹھے میٹھے سب کھا گیا ہے۔"

وہ دیوتا کے ساتھ رامو کی باتیں سن چکا تھا اور اس کے الفاظ دہرا دہرا کر آموں کے رس کے ساتھ زہر کے گھونٹ پی رہا تھا۔ "بدھو جیسے بیوقوفوں اور سکھدیو جیسے عقلمندوں کا خون!"

وہ زیادہ دیر بارش میں آموں کا لطف نہ اٹھا سکا۔ بجلی چمکی اور وہ دیوتا کی مہیب صورت دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری دفعہ بجلی چمکی اور اس نے کلہاڑی اٹھائی اور آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ فطرۃً نڈر ہونے کے باوجود اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

بجلی پھر چمکی اور اس کے ساتھ ہی بدھو کی کلہاڑی مورتی کی گردن پر پڑی کسی بھاری شے کے چبوترے پر گرنے کی آواز آئی۔ بدھو نے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن کسی خیال نے اسے روک لیا۔ بجلی کی چمک میں اس نے دیکھا۔ دیوتا کا سر اس کے پاؤں میں تھا۔ یہ سوچ کر کہ ٹکڑے جوڑے جا سکتے ہیں۔ اس نے کلہاڑی نیچے رکھ کر مورتی کا سر اٹھا لیا اور ٹیلے کے اس سرے پر پہنچ کر جو کہ جھیل کی طرف تھا نیچے پھینک دیا۔ دیوتا کا سر دس گز کی بلندی سے پانی میں گرا اور اس کے ساتھ

ہی بجلی چمکی اور بادل کی ایک خوفناک گرج سنائی دی۔ بارش اور زیادہ تیز ہو گئی بادل کی دوسری گرج اس قدر خوفناک تھی کہ وہ حواس باختہ ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ بجلی کی چمک سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ زمین کانپ رہی ہے۔

بدھو کے سامنے رامو کے یہ الفاظ کہ اگر دیوتا ناراض ہو گیا تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے تو ہمارے کے بھوت بن کر ناچنے لگے۔ بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے جن پر وہ یقین کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک نڈر چرواہے کی زندگی کا کمزور پہلو تھے۔

وہ کسی خطرناک شے کو مقابلے پر دیکھ کر اپنی تمام جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ اندھیری رات میں اس نے اپنی ہی ایک بکری کو بھوت سمجھ کر مار ڈالا تھا لیکن وہ ان چیزوں سے بہت ڈرتا تھا جو سامنے نہیں آتیں۔ بلکہ دل میں چھپ کر دماغ پر حملہ کرتی ہیں۔ پتھر کی مورتی کو اس نے دن کے وقت اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لیا تھا اور شام کے وقت رامو کی باتیں سن کر اس کا اطمینان اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اگر وہ رامو کو اس کے سامنے بیٹھ کر آم کھاتے نہ دیکھتا تو اسے اس خوفناک صورت کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر آم کھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ اگر رامو نے اپنی تقریر میں اس مورتی کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ظاہر نہ کیا ہوتا تو بدھو کو اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی سکھدیو کے متعلق رامو کی نیت سے باخبر ہونے کے بعد اگر بدھو کے سامنے یہ پتھر پہاڑ بن کر بھی کھڑا ہو جاتا تو بھی وہ حملہ کرنے سے باز نہ آتا۔ سکھدیو کی جان بچانے کے لیے وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ جنوں، بھوتوں، چڑیلوں اور دیوتاؤں سے لڑ سکتا تھا لیکن اب سکھدیو کا دشمن مارا جا چکا تھا۔ اس کا سر جھیل میں